مواعظ حکیم الامتؒ اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
مشرف علی تھانوی

مدیر
خلیل احمد تھانوی

شمارہ ۳۹	فروری ۲۰۰۰ء	ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ /	جلد ۱

(۵)

التهذیب

اصلاحِ نفس کا طریقہ

از افادات: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

عنوانات و حواشی: مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ ۱۰/= روپے ○ زرِ سالانہ ۱۰۰/= روپے

پتہ دفتر
ماہنامہ الامداد
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ
۲۹۱ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون نمبر
۵۴۲۲۲۱۳-۴۴۸۰۶۰

ناشر
مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور پاکستان

التہذیب (۵)

حضرت والاؒ نے یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۲۸ رمضان المبارک سنہ ۱۳۳۲ھ کو ۳ گھنٹے ۳۰ منٹ بیٹھ کر "مجاہدات شرعیہ کا اہتمام اور عید کے حکم و احکام" کے موضوع پر عام لوگوں کو بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ تھی۔

مولوی محمد عبداللہ گنگوہیؒ نے اسے قلم بند فرمایا۔

التہذیب - ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ و اصحابہ و بارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم. یریداللہ بکم الیسر ولا یریدبکم العسر ولتکملوا العدۃ ولتکبرواللہ علی ماھدکم ولعلکم تشکرون[1]۔

تمہید

یہ ایک آیت ہے جو متعلق ہے صیام کے۔ اس کے قبل چند جمعوں میں روزہ، تراویح، اعتکاف اور ان کے اسرار و احکام و حقوق و آداب و خواص مع ان کے شعب و متعلقات[2] کے ذکر کیے گئے ہیں جن کا حاصل تھا مجاہدہ کہ حق جل علاشانہ

(۱) البقرۃ آیت ۱۸۵۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ شمار کی تکمیل کرلیا کرو اور تاکہ تم لوگ اللہ کی بزرگی بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو طریقہ بتلادیا اور تاکہ تم لوگ شکر ادا کیا کرو۔ بیان القرآن ج ۱ ص ۱۰۳

(۲) ان کے متعلق شعبوں اور متعلقات کے ساتھ

نے نفس کے قوی منکسر[۱] کرنے کے لیے چند مجاہدات کی تعلیم کی ہے اور وہ مجاہدات تمام قوموں کے مجاہدات سے ممتاز ہیں۔

ترک دنیا کی محبوبیت پر سب کا اتفاق ہے

اور یہ مجاہدات ہمارے ہی نفع اور مصلح کے لیے ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم پر بڑا[۲] بار ڈالا گیا ہے، مجاہدہ تو وہ شئی[۳] ہے کہ ہر سلیم المزاج[۴] اس کی طرف راغب ہے بلکہ جو مجاہدہ نہیں کرتے ہیں وہ بھی اس کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ تمام فساق وفجار مجاہدہ سے خود تو محترز[۵] ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اہل مجاہدہ[۶] کو محبوب رکھتے ہیں۔ جس شخص کو وہ دیکھتے ہیں کہ زاہد ہے تارک ہے بالطبع[۷] اس کی طرف ان کو بھی میلان ہوتا ہے۔ دنیا دار کیسا ہی دنیا دار ہو جب وہ لڑے گا طالب دنیا سے لڑے گا تارک دنیا سے نہ لڑے گا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ صرف یہ وجہ ہے کہ اس کو یہ خیال ہے کہ یہ شخص دنیا کا تارک ہے اس خیال نے اس کے سب خیالات کو پست[۸] کردیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا سے خدا کو بغض[۹] ہے اس کا اثر ایسا عام ہے کہ محبین[۱۰] دنیا کے قلوب میں بھی اس کا اثر ہے اگر دنیا کی محبت اچھی شئی ہوتی تو ایک محب دوسرے محب[۱۱] سے ضرور محبت کرتا لیکن یہ بات نہیں بلکہ آپس میں لڑتے ہیں کٹتے ہیں مرتے ہیں۔ بہر حال زہد فی الدنیا بالطبع مرغوب[۱۲] ہے اور تارک تعلقات سے اول تو محبت ہی ہوتی ہے اور اگر محبت نہ بھی ہو تو بغض[۱۳] تو ہرگز

---

(۱) نفس کی قوتوں کے توڑنے کے لیے (۲) بوجھ (۳) چیز (۴) صحیح طبیعت والا شخص (۵) بچتے (۶) مجاہدے والوں کو پسند کرتے ہیں (۷) مجاہدہ کرنے والا تارک دنیا ہے طبعی طور پر ان کو بھی اس کی طرف میلان ہوتا ہے (۸) کمزور (۹) عداوت (۱۰) دنیا سے محبت کرنے والوں کے دلوں (۱۱) ایک چاہنے والا دوسرے چاہنے والے سے (۱۲) دنیا میں زاہد بن کر رہنا طبعی طور پر پسندیدہ ہے (۱۳) عداوت

نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبِ دنیا ایسی شئی ہے کہ اس کے برے ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ترکِ دنیا ایسی محبوب شئے ہے کہ اس کی محبوبیت پر سب کا اتفاق ہے اسی واسطے اس کا تھوڑا بہت رواج ہر قوم میں ہے۔ عیسائی، ہندو جو کہ منکرین اسلام ہیں وہ بھی اس کو ضروری جانتے ہیں، حکما و فلاسفہ تو خواہ وہ مشائین ہو یا اشراقین مجاہدہ کو بہت ہی ضروری جانتے ہیں۔ چنانچہ تہذیب اخلاق میں ان کی کتابیں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ تہذیب اخلاق بدون نفس کشی[1] کے ہو نہیں سکتی کیونکہ نفس کے موافق[2] کرنے سے بھی تو بہت سی بد اخلاقیاں صادر ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص ہے اس کا جی چاہا کہ فلاں عورت کے پاس جائے تو اگر وہ نفس کو نہیں روکے گا اور خلاف نفس کے نہ کرے گا تو یہ فعل اس سے صادر ہو جائے گا جو کہ تمام ملل میں مذموم[3] و مبغوض و منہی عنہ ہے۔

مجاہدے کی ہر قوم اور ہر شخص کو ضرورت ہے

حکماء میں مجاہدہ ہونے کی ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص حکیم نے دوسرے یونانی حکیم کی تصویر دیکھ کر یہ کہا تھا کہ علم قیافہ کی رو[4] سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ شخص زانی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو فلاں حکیم کی تصویر ہے اس کو ندامت[5] ہوئی۔ مگر اس نے یہ کہا کہ کسی کی ہو، ضرور اس شخص کے اندر یہ عیب ہے لوگوں نے جا کر اس حکیم سے کہا کہ ایک شخص تمہاری نسبت[6] ایسا کہتا ہے۔ سچے لوگ تھے اس نے کہا کہ وہ سچ کہتا ہے۔ میرے اندر

(۱) بغیر نفس کو مارے (۲) نفس کی چاہت کے مطابق کرنے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں (۳) تمام ملتوں میں برا ہے اور ناپسندیدہ ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے (۴) علم قیافہ کے مطابق (۵) شرمندگی (۶) متعلق

مادہ اس فعل خبیث[۱] کا ہے لیکن میں مجاہدہ کرتا ہوں اور نفس کو مغلوب کرتا ہوں اس لیے عمر بھر میں صدور[۲] اس فعل کا کبھی نہیں ہوا تو باوجود ایمان نہ لانے کے ان لوگوں نے نفس کی اتنی بڑی مخالفت کی کہ عمر بھر صدور اس کا نہ ہونے دیا۔ غرض مجاہدہ وہ شئے ہے کہ اس کی پسندیدگی تمام اہل مذاہب کے اندر مسلم ہے بلکہ دہری بھی کسی قدر مجاہدہ ضرور کرے گا بغیر اس کے اس کو بھی چارہ نہیں ہے اگرچہ مقصود اس کا دنیا ہو۔ مثلاً اس کو کسی پر غصہ آیا اور جانتا ہے کہ اگر میں اپنے غصہ کو جاری کروں گا تو خود مجھ کو یہ شخص ضرر[۳] پہنچائے گا تو ایسے موقع پر وہ ضبط سے کام لے گا اور نفس کو روکے گا۔ غرض مجاہدہ کی ہر قوم اور ہر اہل مذہب بلکہ ہر شخص کو ضرورت ہے اور دین میں تو ضرورت ہے ہی دنیا میں بھی ضرورت ہے، باقی شریعت مقدسہ میں جو مجاہدات ہم کو تعلیم کیے ہیں ان کو جو امتیازات ہیں اور جو ان کے خواص و آثار ہیں وہ کسی قوم اور کسی حکیم و فلسفی کے مجاہدہ میں نہیں ہیں، اہل مجاہدہ کی نظر جہاں تک نہ پہنچتی تھی وہاں کی شریعت مقدسہ نے رعایت کی ہے۔ ان خواص و حکم و اسرار[۴] کو بہت مختصر طور سے گذشتہ جمعوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اب موقع اس کا ہے کہ ان مجاہدات کے خاتمہ کا بیان کردیا جاوے کہ یہ بھی قابل اہتمام ہے۔

جمعۃ الوداع کے متعلق کی جانے والی کوتاہیاں

اور آج رمضان المبارک کا جمعہ اخیرہ بھی ہے اس لیے ان بیانوں کا خاتمہ بھی اس جمعہ کو ہو تو بہتر ہے، باقی درمیان میں یہ بیان کردینا بھی ضرور ہے گو

---

(۱) اس برے فعل کا مادہ (۲) مجاہدے کیوجہ سے کبھی اس برے فعل کا ارتکاب نہیں کیا (۳) نقصان (۴) مجاہدوں کی خاصیتوں ان کی حکمتوں اور رازوں کو گذشتہ جمعوں میں بیان کیا جا چکا

میرے موضوع بیان کے خلاف ہے کہ اس جمعہ کے لیے یہ صفت تو صحیح اور واقعی ہے کہ یہ جمعہ اخیرہ ہے باقی جو خصوصیات زائد لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں بڑھائی ہیں ان کا کہیں پتہ و نشان تک نہیں ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ جو بات قابل اعتناء[1] و اہتمام کے ہے اس کی طرف تو التفات تک نہیں اور زائدہ تصنیف[2] کرلیے۔ منجملہ ان کے ایک یہ خاصہ مشہور ہے کہ آخری جمعہ کو جس قدر نئے کپڑے پہن لو اس کا کوئی حساب و کتاب نہ ہوگا، جواب یہ ہے ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین[3]۔ ایک خاصہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دن میں جو خطبہ پڑھا جاوے اس میں وداع[4] کا مضمون اور اس قسم کا مضمون جس سے اظہار تاسف و حزن[5] ہو۔ جناب دل ہی جانتا ہوگا کہ کیسا کچھ افسوس ہے ابھی دل میں امنگیں اور شوق لگ رہا ہے کہ جلدی سے رمضان ختم ہو تو سیویاں اور چھوارے کھائیں اور دل میں کہتے ہوں گے کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ بوجھ اترا۔ دل میں تو خوشی پھر منہ بسورنا[6] تکلف ہی ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر تم کو غم ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ذریعہ سے یہ حکم بھیج دیں کہ میرے بندوں کو رمضان کے جانے سے بہت غم ہے اچھا ایک ماہ کے روزے اور ہم فرض کرتے ہیں تو جناب ابھی سب کے منہ خشک ہوجائیں یہ سب کہنے کی باتیں ہیں رمضان بھر تو ایام شماری رہتی[7] ہے کہ آج اتنے روزے ہوئے اتنے باقی ہیں۔ اور یہ تو عابدوں اور زاہدوں کی کیفیت ہے۔ یاد رکھو جو بات دل میں ہو اس کو ہی ظاہر کرنا چاہیے ورنہ ہم بچارے تو کس قطار میں ہیں صحابہؓ سے اس پر باز پرس ہوگئی ہے۔ صحابہؓ غزوہ بدر کے بعد

(۱) متوجہ ہونے اور اہتمام کے قابل ہے (۲) زائد باتیں اپنی طرف سے گھڑ لیں (۳) البقرہ آیت ۱۱۱۔ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو (۴) رخصتی کا مضمون (۵) غم و افسوس کا اظہار ہو (۶) منہ سے ناپسندیدگی کا اظہار کرنا (۷) دن گنتے رہتے ہیں کہ اتنے روزے باقی رہ گئے

تمنا کیا کرتے تھے کہ کاش کوئی دن مثل بدر کے ہو اس میں ہم دشمن سے مقابلہ کریں جب غزوہ احد ہوا تو اس میں ہزیمت[۱] ہوئی اور بعض صحابہ سے کچھ غلطی اجتہادی بھی ہوئی جس کا بڑا قصہ ہے تو اس پر حق تعالیٰ ان کو متنبہ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ[۲]۔ یعنی تم لوگ موت کی تقار سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے اب تو تم نے اس کو دیکھ لیا اور تم اس کو دیکھ رہے ہو جب صحابہؓ کو اس پر تنبیہ ہوئی تو ہمارا کیا منہ ہے۔

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ   برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

(آرزو اتنی چاہیے جتنا کہ ضرورت ہے جس طرح کہ ایک گھاس کا تنکا بھی پہاڑ کی چوٹی کے لیے کافی ہوتا ہے)

ہم کو چاہیے کہ سنبھل کر بولیں۔ ہم ضعیف[۳] ہیں ہم کو چاہیے کہ یوں کہیں کہ الٰہی شکر ہے ہم سے یہ عبادت جس طرح بنی[۴] ادا ہو گئی اب آپ اس کو قبول کیجیے افسوس اور رنج وغیرہ کا خلاف واقعہ اظہار نہ کرو۔ اور اگر کچھ رنج ہو بھی تو اس پر مسرت اس قدر غالب ہے کہ وہ رنج قابل اظہار نہیں ہے۔ اور وہ مسرت یہ ہے کہ غنیمت ہے کہ روزہ ہمارا بیچ میں ٹوٹا نہیں۔ خیر وعافیت سے سب پورے ہو گئے بجائے رنج کے خوش ہونا چاہیے۔ اور خدا جانے یہ رنج کس نے اختراع[۵] کر لیا ہے۔

---

(۱) عارضی شکست (۲) سورۃ آل عمران آیت ۱۴۳ (۳) کمزور (۴) جس طرح بھی ہم ادا کر سکے (۵) ایجاد کیا

روزہ دار کے لیے دو خوشیاں

روزے کے ختم پر تو ہم کو تعلیم کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ **للصائم فرحتان ،فرحة عندالافطار ،وفرحة عند لقاء ربه.** یعنی روزہ دار کو دو خوشیاں ہوتی ہیں۔ ایک خوشی تو افطار کے وقت اور دوسری اپنے پروردگار کے ملنے کے وقت اگر ہمارے دعووں کی رعایت ہوتی تو بجائے فرحت[1] کے افسوس ظاہر کیا جاتا، اس لیے کہ جو علت[2] ہے اس رنج[3] کی یعنی رمضان المبارک کا رخصت ہونا۔ اس کا کچھ حصہ افطار کے وقت بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ایک دن اور کم ہوگیا لیکن یہ نہیں فرمایا بلکہ خوشی کی خبر دی گئی، اور راز اس میں یہ ہے کہ روزہ فرض ہے اور تراویح اور تہجد جو شب کی عبادات ہیں وہ سنت ہیں اور یہ مسلم ہے کہ جس قدر قرب ادائے فرض سے ہوتا ہے اس قدر ادائے سنت و نوافل سے نہیں ہوتا تو اس کا مقتضی یہ تھا کہ جب روزہ تمام ہو تو ہم کو رنج ہونا چاہیے تھا کہ افسوس ایک رات تک ہم روزہ کے برکات سے محروم رہیں گے کیونکہ رات کو روزہ نہیں ہوتا۔ پس اس خیال کے رفع[4] کرنے کے لئے ہم کو تعلیم فرماتے ہیں فرحت کی، باقی جو خوشی ہم کو افطار کے وقت ہوتی ہے دیکھنے کی یہ بات ہے کہ کونسی خوشی کی خبر دی گئی ہے اور کس بات کی خوشی کی خبر ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دو قسم کی خوشی ہوتی ہے۔ ہم سے[5] والوں کو اس کی خوشی ہوتی ہے کہ اب کھانے کا وقت آگیا ہے۔ پھلکیاں کھائیں گے اور جلیبیاں کھائیں گے اور جو اللہ والے ہیں ان کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ اللہ تعالی کا شکر ہے کہ اللہ تعالی نے ہماری عبادت کو محفوظ رکھا اور بخیریت روزہ ختم ہوگیا بہر حال خواہ

---

(۱) خوشی (۲) وجہ (۳) غم (۴) دور کرنے (۵) ہم جیسوں کو

کسی قسم کی خوشی ہو سب محمود و مطلوب[1] ہے باقی رہا رنج کے مطلوب ہونے کی تو کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہر حال رنج نہ واقع ہے اور نہ اس کی کوئی اصل ہے پس تاسف اور رنج[2] کرنا اور خطبہ میں الوداع الوداع یا شہر رمضان[3] بالکل بے اصل ہے، ہاں۔ ہاں رمضان المبارک کے آنے سے پہلے کا تو ایک خطبہ خاصہ منقول ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ شعبان کے جمعہ اخیرہ میں حضور ﷺ نے خطبہ پڑھایا جس میں فرمایا : **یایھاالناس قد اظلکم شھرعظیم**[4] **الخ** پس رمضان کے آنے کی خوشی تو ظاہر فرمائی ہے مگر جانے کا غم ظاہر کرنا اور خطبہ وداعی پڑھنا کہیں منقول نہیں یہ سب تقریر جملہ معترضہ کے طور پر آخری جملہ کے متعلق تھی۔

سورج گرہن کے احکام اور بعض دوسری کوتاہیوں کا ذکر

مقصود تو میرا یہ ہے کہ یہ آخری جمعہ ہے اور آخری جمعہ کو یہ ضرور ہے کہ رمضان المبارک ایک ہفتہ سے کم رہ جاتا ہے چنانچہ آج ۲۸ تاریخ ہے اور وہاں باقتضائے وقت یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ ۲۸ کو سورج گرہن تخمیناً پانچ بجے سے شروع ہوجائے گا۔ حدیثوں میں ایسے وقت نماز آئی ہے جس کا لقب صلوۃ الکسوف ہے۔ حضور ﷺ نے خود بھی پڑھی ہے جس میں قراۃ سجدہ رکوع طویل تھا مگر وقت بہت کم اور نازک ہے اور نیز احتمال ہے کہ عصر کے بعد ہوجاوے اس لیے نوافل اس وقت مکروہ ہیں اس لیے بجائے نوافل کے ذکر میں مشغول ہونا چاہیئے۔ لوگوں نے جس طرح جمعہ اخیرہ رمضان کے کچھ خواص تراشے[5] ہیں ایسے ہی

---

(۱) سب پسندیدہ اور طلب کے قابل ہے (۲) افسوس اور رنج کا اظہار کرنا (۳) رخصت اے ماہ رمضان کہنا (۴) تم پر ایک عظیم المرتبت مہینہ آرہا ہے (۵) اپنی طرف سے گھڑے ہیں

سورج گرہن کے بھی اپنی طرف سے کچھ احکام مقرر کیے ہیں چنانچہ مشہور ہے کہ سورج گرہن کے وقت کھانا نہ کھاوے۔ اصل تو اس کی یہ تھی کہ وہ وقت جب مشغولی مع اللہ اور ذکر کا ہے تو ظاہر ہے کہ کھانا خود ہی اس وقت ترک [1] ہو جاوے گا لیکن ذکر اللہ اور نوافل کو تو لوگوں نے اڑا دیا اب بجائے اس کے بیکار بیٹھے رہیں گے شطرنج اور گنجفہ کھیلیں گے مگر اتنی توفیق نہ ہوگی کہ اللہ کی یاد کریں۔ اسی طرح جب کوئی محلہ میں مر جاتا ہے تو مشہور ہے کہ کھانا کھانا جائز نہیں دنیا بھر کے سب کام جائز مگر کھانا جائز نہیں۔ غیبتیں کریں گے، دغابازی کی گفتگو کریں گے ہاں کھانا نہ کھاویں گے۔ اس کی اصل یہ تھی کہ ایسے وقت جبکہ اپنے پاس والوں کو غم ہو اور خود اپنے کو بھی ہوتا ہے تو کھانا کھانا طبعاً مکروہ [2] ہے شرعاً مکروہ نہیں لیکن جب دنیا بھر کے قصے اور گناہ تک تو کریں تو کھانا جو کہ فی نفسہ مباح [3] ہے اس سے کیوں احتراز [4] کیا جاوے ایسے ہی یہ بھی مشہور ہے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کھانا نہ کھاوے۔ اصل تو اس کی یہ تھی کہ وہ وقت فضیلت کا ہے اور اکثر بزرگوں کی عادت رہی ہے کہ عصر کے بعد سے مغرب تک ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں۔

مرتے وقت شیطان کا پیشاب کا پیالہ پیش کرنا من گھڑت بات ہے

جب ان کو عام لوگوں نے مشغول دیکھا تو اس سے یہ سمجھا کہ اس وقت کھانا کھانا ممنوع ہے اور وجہ اس کی یہ تراشی [5] ہے کہ مرتے وقت عصر کا وقت نظر آتا ہے اور شیطان مرنے کے وقت موت [6] کا پیالہ لاتا ہے اور اس شخص کو پیاس

---

(۱) چھوٹ جائیگا (۲) ناپسندیدہ (۳) جو کہ اپنی ذات کے اعتبار سے جائز ہے (۴) بچا جائے (۵) وجہ اس کی یہ گھڑ لی (۶) پیشاب کا پیالہ

بہت ہوتی ہے تو اگر اس وقت کھانے پینے کی عادت ہوگی تو یہ شخص پی جاوے گا نعوذ باللہ بالکل غلط اور جھوٹ بات ہے۔ حضور ﷺ نے ہم کو بہت چھوٹی چھوٹی باتیں جس سے ادنیٰ سے ضرر دینی بلکہ اکثر تو اگر دنیوی کا احتمال بھی ہوا ہے وہ بتلائی ہیں چہ جائے کہ وہ اتنا بڑا نقصان عظیم جس شے سے لازم آتا ہے اور ہم کو منع نہ کریں حضور ﷺ نے یہاں تک ہم کو منع فرمایا ہے کہ ایک پاؤں میں جوتی پہن کر مت چلو اس لیے کہ اس طرح چلنے سے احتمال گرجانے کا ہے پس جو پیغمبر ﷺ اتنا بڑا شفیق ہو کیا وہ ایسے عمل سے منع نہ کریں گے جس کے اختیار کر لینے سے شیطان کے موت پینے کا احتمال ہو بالکل غلط ہے۔ ہاں اتنا آیا ہے کہ قبر میں جب سوال ہوتا ہے۔ تو مثلت لہ الشمس یعنی دھوپ نکلی ہوئی اس کو نظر آتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے نماز کو دیر ہوتی ہے میں نماز تو پڑھ لوں۔ باقی مرنے کے وقت ایسا دکھائی دینا نہیں آیا ہے اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ اس کی عمر کا خاتمہ ہو گیا ہے اس لیے اگر اس کو دن بھی ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہو تو کچھ تعجب نہیں لیکن یہ موت پینے کا مضمون قابل اعتبار نہیں ہے"[1]۔

فرشتے غلطی نہیں کرتے

اور اگر کہا جاوے کہ ہم نے خوب دیکھا ہے کہ مرتے وقت لوگوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے تو جناب خدا خیر کرے ہم نے ایسے مردے بھی دیکھے ہیں کہ جنہوں نے بیان کیا کہ ہم مر گئے تھے اور جب ہماری روح فرشتے لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک بڈھا سا آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس کے سامنے ایک رجسٹر کھلا ہوا رکھا ہے اس نے اس میں دیکھ بھال کر کہا کہ اس کو ہم نے نہیں بلایا وہ دوسرا

---

[1] یہ پیشاب پینے والی بات اعتبار کے قابل نہیں

شخص ہے اس لیے واپس کردیا گیا چنانچہ وہ زندہ ہوگیا۔ اس حکایت سے لازم آتا ہے کہ عزرائیل علیہ السلام غلطی کرتے ہیں اور اگر عزرائیل علیہ السلام غلطی کرتے ہیں تو ان میں اور جبرائیل علیہ السلام میں کچھ فرق نہیں وہ بھی ضرور غلطی کرتے ہوں گے اور جب کسی کے مارنے میں غلطی کی تو کسی شے کے پہنچانے میں بھی غلطی کا احتمال ہے اور وحی بھی ایک شے ہے اس کے پہنچانے میں جبرائیل علیہ السلام نے ضرور احتمال ہے کہ شاید غلطی کی ہو تو جناب ایسے احتمالات سے تو قرآن سے بھی نعوذ باللہ امن[1] اٹھا جاتا ہے اور غالی شیعوں کا مذہب حق معلوم ہوتا ہے کہ "جبرائیل علیہ السلام غلط کردہ ومقصود علی بود[2]" توبہ کرو ایسے قصوں سے یہ سب دماغ کا تصرف[3] ہے۔ دماغ میں جیسے خیالات گھومتے ہیں اسی قسم کے نظروں کے سامنے متمثل[4] ہوجاتے ہیں باقی فرشتوں سے غلطی اور خطاء کا احتمال نہیں ہے جس کی موت آتی ہے اور جس کی نسبت حکم ہوتا ہے اسی کی جان قبض کرتے ہیں یہ احتمال نہیں کہ دوسرے کی جان قبض کرلیں چنانچہ صاف ارشاد ہے۔ حتی اذاجاء احدکم الموت توفته رسلنا وھم لا یفرطون[5]۔ یعنی یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی جان لیتے ہیں اور وہ اس میں تقصیر[6] نہیں کرتے۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے جس سے عموماً معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کسی حکم کے خلاف نہیں کرتے لایسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون[7] غضب کی بات ہے کہ قرآن کا انکار، عقل کے خلاف ایسے امور کا اعتقاد کر لیتے ہیں۔ پس اگر

---

(۱) اطمینان (۲) جبرئیل علیہ السلام نے غلطی کی مقصود حضرت علی تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے وحی حضرت علی کی طرف بھیجی تھی جبرئیل نے غلطی سے حضور پر پہنچادی یہ بعض شیعوں کا باطل عقیدہ ہے (۳) دماغی اختراع ہے (۴) ویسے ہی نظر آنے لگتے ہیں (۵) الانعام آیت ۶۱۔ یہاں تک کہ جب تم میں کسی کو موت آپہنچتی ہے اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے قبض کرلیتے ہیں اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔ بیان القرآن ج ۳ ص ۱۰۱ (۶) کوتاہی (۷) سورۃ الانبیاء آیت ۲۷۔ وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کرسکتے اور وہ اس کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں۔

یہ قصہ صحیح بھی ہو تو یہ قوت متخیلہ کا تصرف[1] ہے اور اگر فرض کرلیا جاوے کہ شیطان اس وقت موت کا پیالہ لیے ہوئے نظر بھی آتا ہو تب بھی اس وقت کھانے پینے کی عادت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس موت کو ضرور پی لے، اس لیے کہ مرنے کے وقت مردہ کو عالم آخرت کا انکشاف[2] ہوجاتا ہے اور یہ قصہ اگر ہو بھی تو اس عالم کا نہ ہوگا بلکہ ایک برزخی واقعہ ہوگا اور اس عالم کے خواص وعادات اس عالم کے خواص وعادات سے بالکل مغائر اور جدا ہیں۔

مومنین صالحین کو موت کے وقت فرشتے تسلی دیتے ہیں

اس عالم کے عادات طبیعہ اس عالم میں مؤثر نہیں ہیں ہاں عبادات نصاً بیشک مؤثر ہیں جیسا حدیث میں ہے ادعونی[3] اصلی اور اگر اس سے بھی قطع نظر کی جاوے تب بھی شیطان موت نہیں پلاسکتا۔ اس لیے۔ ع

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست[4]۔

شیطان کا داؤ مخلصین پر نہیں چلتا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ **انه ليس له سلطن على الذين آمنوا و على ربهم يتوكلون**[5]۔ سلطان نکرہ ہے تحت میں نفی کے آرہا ہے[6] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین متوکلین پر اس کا بالکل قابو نہیں چلتا بلکہ اس وقت مومنین پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور وہ تسلی کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملئكة

---

(۱) خیالی تصور کی کرشمہ سازی ہے (۲) عالم آخرت واضح ہوجاتا ہے (۳) مجھے چھوڑو میں نماز پڑھ لوں (۴) دشمن کیا کرسکتا ہے جبکہ دوست (اللہ تعالیٰ) مہربان ہو (۵) سورۃ نحل آیت ۹۹ (۶) نکرہ جب تحت النفی ہو عموم کا فائدہ دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کا بالکل قابو نہیں چلتا

ان لا تخافوا ولا تحزنوا و ابشروا بالجنة التی کنتم توعدون نحن اولیاء کم فی الحیوۃ الدنیا و فی الاخرۃ ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون . نزلا من غفور رحیم[1].

یعنی بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر جم گئے ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو اور جس جنت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس سے خوش ہو ہم تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگانی میں اور آخرت میں۔ اور تمہارے لیے آخرت میں وہ چیزیں ہیں جن کو تمہارے جی چاہتے ہیں اور تمہارے لیے وہاں وہ ہے جس کو تم مانگو (یہ سب) مہمانی ہے غفور رحیم کی طرف سے۔ اور نیز وہ وقت چونکہ اس شخص پر بہت سخت ہوتا ہے اس لیے اس وقت ضرور رحمت حق متوجہ ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ انا عندالمنکرۃ قلوبھم[2]

اور مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب انجا رود

(جہاں کہیں پستی ہوتی ہے وہیں پانی جاتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے وہیں اس کا حل ہوتا ہے)

ہر کجا رنجے شفا آنجا رود ہر کجا دردے دوا آنجا رود

(جہاں رنج ہوتا ہے وہیں شفا ہوتی ہے اور جہاں درد ہوتا ہے وہیں اس کی دوا ہوتی ہے)

پس اور فرماتے ہیں۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

---

(۱) سورۃ حم سجدہ آیت ۳۲ (۲) میں ٹوٹے دلوں کے ساتھ ہوتا ہوں

(اپنے دل اور فہم کو گستاخ کرلینا یہ صحیح راستہ نہیں بلکہ شکستہ ہوجانا ہی بادشاہ کی مہربانیوں کے حاصل کرنے کی دلیل ہے)

رحمت حق بہانہ می جوید

ایک قصہ منقول ہے کہ نبی علیہ السلام کا چند قبور پر گذر ہوا دیکھا کہ مردہ قبور میں معذب[1] ہیں جہاں تشریف لے جارہے تھے جب وہاں سے واپس ہوئے تو دیکھا رحمت ہورہی ہے۔ حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ اس وقت تو میں نے ان کو مبتلائے عذاب دیکھا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد ان سے کوئی عمل صادر نہیں ہوا پھر کیا وجہ رحمت کی ہوئی۔ ارشاد ہوا کہ ان کے کفن گل گئے، ان کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہوگئیں اس لیے ہم کو رحم آیا کہ ان پر کیا عذاب کیا جاوے جبکہ ان پر رحمت ہوئی تو قلوب شکستہ پر تو ضرور ہی رحمت ہوتی ہے۔

شیطان کا پیشاب ذی جرم نجاست نہیں

غرض وہ وقت رحمت کا ہے شیطان کا داؤ وہاں نہیں چلتا پھر یہ کہ اگر اس وقت حواس باقی ہیں تو جان بوجھ کر مُوت کیوں پی وے گا۔ اور حواس جاتے رہے اور اس حالت میں شیطان کا مُوت بھی پی لیا تو حرج کیا ہوا۔ اس سے ایمان میں کچھ خلل نہیں۔ شیطان کے اندر جزو ناری زیادہ ہے اس کا مُوت آدمی کے مُوت سے تو بہر حال نجاست میں کم ہوگا۔ اس وقت تو اگر آدمی کا مُوت بھی پی لے تو ایمان میں خلل نہیں آتا۔ بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا مُوت کوئی ذی جرم نجس بھی[2] نہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص صبح تک

---

(۱) مردہ کو قبر میں عذاب دیا جارہا ہے (۲) جسم رکھنے والی نجاست بھی نہیں

سوتا رہے تو شیطان اس کے کان میں مُوت دیتا ہے۔ اور یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ کان کو پاک کیا کرو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ذی جرم نجس چیز[1] نہیں ہے۔ غرض یہ بالکل بے جوڑ اور بے اصل بات ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مرنے کے وقت اگر رحمت ہوتی ہے تو اس کا کیا مطلب جو بکثرت سنا ہے کہ مرتے وقت بعضوں کا ایمان مسلوب ہوجاتا ہے۔ یاد رکھو پریشانی اور بد حواسی کی حالت میں کسی کا ایمان سلب نہیں ہوتا۔ ایمان مثل ایک قلعہ مضبوط کے ہے۔ وہ ایسے سیلابوں سے شکستہ[2] نہیں ہوتا۔ یہ ہرگز نہیں کہ مرنے کے وقت بلا اختیار ایمان سلب ہوجائے۔ ہاں پہلے سے جو لوگ مسلوب الایمان[3] ہیں زندگی میں اور دنیا کے کاموں میں ان کو اپنی بے حسی سے اپنا مسلوب الایمان ہونا منکشف[4] نہیں ہوتا اور مرنے کے وقت چونکہ ظہور حقائق کا وقت ہوتا ہے اس لیے اس کو اس کا علم ہوتا ہے اسی لیے مجازاً کہدیا جاتا ہے کہ فلاں مسلوب الایمان[5] ہوکر دنیا سے گیا ہے۔

مرتے وقت بلا ارادہ زبان سے کفریہ کلمے کے نکلنے پر مواخذہ نہیں

اور یہ جو مشہور ہے کہ مردہ کے پاس صرف الا اللہ پڑھنا چاہیے لاالہ اس کے پاس نہ ملاوے اس لیے کہ اگر لاالہ پر دم نکل گیا تو بے ایمان مرے گا کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ کوئی معبود نہیں ہے تو اس سے حق تعالی کی معبودیت کی نفی بھی ہوگئی اور یہ کفر ہے یہ بھی بالکل بے اصل اور خلاف عقل ہے اس لیے کہ اگر

(۱) کوئی جسم رکھنے والی نجاست بھی نہیں (۲) کمزور (۳) جن کا ایمان پہلے ہی سے رخصت ہوچکا ہے (۴) اپنے ایمان کا رخصت ہوجانا ان کو معلوم نہیں ہوتا (۵) فلاں بے ایمانی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوا

لاالہ پر خاتمہ ہوگیا اور دل میں اس کے تھا کہ الا اللہ بھی کہوں گا تو کفر کہاں لازم آیا۔ اللہ تعالیٰ تو دل کو ہی دیکھتے ہیں۔ اور نیز ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ الا اللہ کہنے نہ پایا اس کو اس قدر وقت ہی نہ ملا۔ باقی یہ ظاہر ہے کہ توحید اس کے ذہن میں پہلے سے تھی۔

ما بروں را ننگریم وقال را ما دروں را بنگریم وحال را

(ہم کسی شخص کی ظاہری حالت اور اس کی گفتگو کو نہیں دیکھتے بلکہ ہم اس کی اندرونی کیفیت اور حالت دیکھتے ہیں)

اور یہاں تو فقط ناتمام عبارت ہی تھی وہاں تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص سر تا سر غلط کہہ ڈالے اور دل میں نہ ہو تو کچھ حرج نہیں اور اس کے ایمان میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے بندہ کے توبہ کرنے پر اس شخص سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ اس کا اونٹ راہ میں گم ہوجائے اور تمام سامان کھانے پینے کا اسی پر ہو۔ اور وہ پریشان ہو کر اس کو ڈھونڈھتا ہے اور جب ناامید ہوگیا تو ایک درخت کے نیچے تھک کر اور اپنی جان سے مایوس ہو کر لیٹ رہا اور اسی حالت میں اس کو نیند سی آگئی جب آنکھ کھلی تو دیکھا اونٹ کھڑا ہے۔ تو جوش مسرت کے ساتھ کہتا ہے۔ **اللھم انت عبدی و انا ربک اخطاء من شدۃ الفرح۔** یعنی اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شدت خوشی کی وجہ سے بہک گیا۔ دیکھو اس نے کلمہ کہا لیکن چونکہ نہ اس کے دل میں تھا اور نہ زبان سے قصد[1] کہنے کا رکھتا تھا۔ خدا تعالیٰ کی نعمت پر خوشی کے جوش میں زبان بھٹک[2] گئی اس لیے کچھ مواخذہ[3] نہیں۔ اور نہ اس کے ایمان میں کچھ فرق آیا۔ ورنہ

(۱) ارادہ (۲) پھسل گئی (۳) پکڑ

حضور ﷺ اس کے نقل کے وقت انکار فرماتے۔

مقام ناز کے آداب جدا ہیں

اور جیسے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے برخ نام تھا، موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بارش کے لیے ان سے دعا کراؤ وہ بزرگ مقام ناز میں تھے، ان سے جب دعا کے لیے کہا گیا تو انہوں نے جو کلمات کہے ہیں اگر کوئی اور شخص کہدے تو سخت بے ادبی ہے اور جنت میں بھی بعض لوگ ایسے کلمات کہیں گے کہ وہ بظاہر بے ادبی ہے لیکن چونکہ دل میں بے ادبی کا قصد[۱] نہیں اس لیے کچھ مضر[۲] نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے آخر جو شخص دوزخ سے نکلے گا اس سے کہا جائے گا تجھ کو دنیا اور دنیا سے کئی حصے زیادہ جنت میں جگہ دی گئی۔ وہ عرض کرے گا أتستہزئ مني وأنت رب العالمین۔ یعنی کیا آپ مجھ سے ٹھٹھا کرتے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب ﷺ کو اس پر ہنسی آ گئی۔ اور جیسے افک کے قصہ میں جب حضرت عائشہؓ کی براءت[۳] نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا ابشری یا عائشۃ فقد برأک اللہ یعنی خوش ہو اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بری کر دیا۔ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ کھڑی ہو کر حضور ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔ عائشہؓ نے فرمایا کہ میں ان کا شکریہ کیوں کروں میں تو اپنے اللہ کی حمد بیان کروں گی۔ دیکھیے بظاہر تو یہ کلمہ بے ادبی کا ہے۔ لیکن حقیقت اور منشاء اس کا حضور ﷺ کی محبت ہے۔ حضرت عائشہؓ کا قلب حضور ﷺ کی محبت سے لبریز تھا اور جیسے محبوب ناز کیا کرتا ہے کبھی

(۱) ارادہ (۲) نقصان دہ (۳) منافقین نے جو حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تھی اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس الزام سے حضرت عائشہ کو بری کر دیا

محب بھی کیا کرتا ہے لیکن ہر شخص کا حوصلہ نہیں ہے کہ ایسی بات کہے یا جی میں لاوے۔ اس لیے کہ۔

نازراروے بباید ہمچو ورد چوں نداری گردبد خوئی مگرد

(ناز برداری کے لیے پکا عشق چاہیے اور اگر تیرے پاس پکا عشق نہیں ہے تو پھر یہ بری عادت چھوڑ دے)

اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں اے عائشہ مجھے معلوم ہوجاتا ہے جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو اور جس وقت راضی ہوتی ہو تو قسم اس طرح کھاتی ہو لاورب محمد اور جب ناراض ہوتی تو کہتی ہو لاورب ابراھیم حضرت عائشہؓ نے فرمایا یارسول اللہ ﷺ **لا اهجر الا اسمک** یعنی یارسول اللہ ﷺ میں اس وقت صرف آپ کا نام ہی چھوڑ دیتی ہوں یعنی دل میں تو آپ ہی بسے ہوئے ہیں لیکن صرف نام مبارک زبان سے ترک کردیتی ہوں۔

مشاہدہ حق

نام پر ایک حکایت یاد آئی ہمارے حضرت میاں جی نور محمد[1] صاحبؒ کے ایک خلیفہ شیر خان نامی لوہاری کے رہنے والے تھے جب ان کا انتقال ہونے لگا تو ساکت[2] لیٹے ہوئے تھے لوگ کلمہ کی تلقین[3] کرتے تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھے۔ لوگوں کو بہت خیال ہوا کہ افسوس ہے کہ خانصاحب ہمیشہ تو ذاکر شاغل[4] رہے اور آخر میں یہ کیفیت ہے کہ کلمہ تک زبان سے نہیں نکلتا اور حضرت میاں جی کو جا کر اطلاع کی حضرت تشریف لائے اور پوچھا کہ خانصاحب

(۱) حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے پیر (۲) خاموش (۳) کلمہ پڑھنے کو کہتے تھے (۴) ساری زندگی تو اللہ کے ذکر میں مشغول رہے

کس حال میں ہو فرمایا کہ حضرت لوگوں کو روک دیجیے مجھے پریشان نہ کریں یہ مجھ کو مسمیٰ سے اسم کی طرف لاتے ہیں مشاہدہ مسمیٰ[1] میں ہوں۔ اور یہ مجھ کو اسم کی طرف کھینچتے ہیں حقیقت یہ ہے۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

(کوئی کچا آدمی پکا حال یعنی اندرونی حقیقت معلوم نہیں کرسکتا بہتر یہ کہ بات مختصر کرکے رخصت لے لی جائے)

لاورب ابراھیم کہکر حضرت عائشہؓ نے نام بھی حضور ﷺ کا چھوڑ دیا اور خفا بھی ہورہی ہیں اور پھر منہ میں تو یہ بات کیا ہے وہ یہی ہے کہ دل تو محبت سے پر تھا اور اس ناراضی کا منشا بھی وہی محبت تھی پس اگر دل میں ایمان ہے اور زبان سے بدحواسی میں کلمہ کفر کا بھی کہدیا تب بھی وہ شخص مومن ہے اس کے ایمان میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا یہ کلمہ کفر ایسا ہی ہے۔

خوں شہیداں واز آب اولیٰ تراست   ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست

(شہید لوگ اپنا خون بہانا پانی بہانے سے بہتر سمجھتے ہیں اور اگر یہ غلطی ہے تو سینکڑوں اچھائیوں سے بہتر ہے)

موت کے وقت سمجھدار آدمی پاس ہونا چاہیئے

بحرالرائق میں لکھا ہے کہ اگر مرتے وقت کسی مسلمان کے منہ سے کلمات کفر نکلیں تو وہ سب معاف ہیں مرنے کا وقت بڑا نازک وقت ہے تھوڑی سی آدمی

---

(۱) یعنی مجھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہورہا ہے میں ان کو دیکھنے میں مشغول ہوں اور یہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں صرف اللہ کا نام لیتا رہوں آپ ان کو منع فرمادیجیے سچ کہا ہے کہ کچا آدمی پختہ کار کی حقیقت معلوم نہیں کرسکتا

کو تکلیف ہوتی ہے تو پریشان ہوجاتا ہے اور وہ وقت تو جان نکلنے کا ہے اسی واسطے ایسے وقت سمجھدار آدمی پاس ہونا چاہیئے تا کہ مردہ کی حالت کو سمجھیں بعض حالتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ پاس والوں کی بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔

حضور ﷺ میں تمام انبیاء علیہم السلام کی شانیں جمع ہیں اور اولیا میں کوئی ایک شان نمایاں ہوتی ہے

ایک بزرگ تھے جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے یہ کہا لا الہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ اور کہہ کر رحلت[1] فرما گئے لوگوں نے شور مچادیا کہ افسوس یہودی ہو کر مرے ہیں۔ یہودی پر اسی کے مناسب ایک اور حکایت یاد آئی۔ حضرت نجم الدین کبریٰؒ ایک بڑے بزرگ ہیں کبریٰ کا لفظ سن کر طالب علموں کو بڑا خلجان[2] ہوا ہوگا کہ مونث کا صیغہ مذکر کی کیسے صفت بن گیا یہ صفت ان کی نہیں ہے اس کا موصوف محذوف ہے یہ عالم ہیں اور اپنے زمانہ میں مباحثہ کے اندر "الطامۃ الکبریٰ" مشہور تھے۔ اکثر استعمال سے موصوف تو اڑ گیا[3] کبریٰ رہ گیا۔ غرض ان کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے ان کے کسی مرید نے ان بزرگ کی زیارت کے لیے ان سے اجازت چاہی۔ یہاں ایک بات سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم و تلقین کا تعلق تو ایک ہی سے رکھے، باقی عقیدت و محبت و زیارت سب بزرگوں سے رکھے تو کچھ حرج نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب و مریض کہ جب تک جم کر ایک کا علاج نہ کرے گا تو مرض کا زوال نہ ہوگا اور اگر ہر ایک سے دوا پوچھے شفا نہ ہوگی۔ حضرت شیخ نجم الدینؒ سے اجازت لے کر ان بزرگ کی زیارت کے لیے گئے چلتے وقت پیر نے کہدیا تھا کہ میری طرف سے بھی

---

(۱) انتقال (۲) پریشانی ہوئی ہوگی (۳) الطامۃ ہو کر موصوف تھا حذف ہو گیا صرف کبریٰ رہ گیا

حضرت کی خدمت میں سلام کہدینا جب وہاں پہنچے تو پیر کا سلام عرض کیا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ تمہارا یہودی پیر اچھا ہے۔ مرید صاحب دل ہی دل میں بہت بگڑے کہ یہ اچھے بزرگ ہیں میرے پیر کو انہوں نے یہودی کہدیا لیکن چونکہ پیر سے ان کے مناقب سن چکے تھے اس لیے بولے کچھ نہیں۔ جب واپس پیر کی خدمت میں آئے تو پیر نے پوچھا ہمارا اسلام بھی کہدیا تھا۔ عرض کیا حضرت کہدیا تھا لیکن وہ تو بہت بے ڈھب آدمی ہیں۔ انہوں نے آپ کو یہودی کہا۔ فرمایا الحمدللہ آج معلوم ہوا کہ میں کس مقام پر ہوں اور بہت خوش ہوئے اور یہ فرمایا کہ بھائی تجھ کو خبر نہیں ہے کہ یہ یہودی سے کیا مراد ہے تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے اندر تمام انبیاء کی شانیں جلوہ گر ہیں اسی مضمون کو کسی نے شعر میں نظم کیا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(تیرے پاس یوسف علیہ السلام کا حسن عیسیٰ کی پھونک اور موسیٰ کا ید بیضا ہے یعنی جو خوبیاں اور لوگوں میں الگ الگ تھیں وہ تیرے پاس مجموعی طور پر ہیں)

ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کی شان حضور ﷺ میں موجود ہے۔ حضور شان جمعیت لیے ہوئے ہیں اب اولیاء امت میں سے ہر ایک کی شان جدا ہے۔ کسی کے اندر ابراہیم علیہ السلام کی شان ہے کوئی موسیٰ علیہ السلام کی شان پر ہے جو بزرگ جس نبی کی شان لیے ہوئے ہوتے ہیں ان کو ان کے قدم[1] پر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ قدم موسیٰ پر ہیں اور فلاں قدم ابراہیم پر ہیں یعنی شان موسوی اور ابراہیمی پر ہیں۔ لکن لا من حیث انہ شان ابراہیم و موسیٰ بل من حیث انہ شان محمد ﷺ لانہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع

(۱) ان کی شان پر

لمثوب کُلّہا"(۱)۔ پس جن بزرگ نے مرنے کے وقت لاالٰہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ پڑھا انہوں نے ظاہر کردیا کہ قدم موسیٰ علیہ السلام پر ہوں یہی مطلب یہودی کہنے کا بھی ہے اب بچارے عوام اس بات کو کیا جانیں اس لیے مرنے کے وقت ایسے لوگ پاس ہونے چاہئیں جن کو دین کی سمجھ ہو۔ بہر حال اصلی مقصود مسمیٰ ہے۔ غلبہ حال میں اگر اسم میں غلطی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ایسے امور سے ایمان نہیں جاتا۔

عوام کی بے اعتدالیاں

یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعض عوام الناس کہا کرتے ہیں کہ فلاں نے چمار کا حقہ پی لیا اس لیے اس کا ایمان جاتا رہا یہ بالکل غلط ہے۔ کیا چمار کے حقہ کی نلکی میں ایمان گھس گیا ہے۔ چمار کا حقہ تو درکنار اگر سور کا گوشت بھی کوئی مسلمان کھالے تو ایمان نہیں جاتا۔ ہاں سخت گناہ ہوگا۔ اور اگر بھول کر یا کسی نے بلا اطلاع کھلادیا تو گناہ بھی نہیں ہاں جان کر اگر کھایا تو گنہگار ہوگا۔ ایمان ایسی شئی نہیں جو ایسی باتوں سے جاتا رہے۔

بے ڈھنگا سوال

ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہیؒ رامپور سے آتے ہوئے اسلام نگر ٹھہرے وہاں ایک خانصاحب پہلے سے مہمان تھے وہ حضرت کی خدمت میں آکر بیٹھے اب خانصاحب کو خیال ہوا کہ حضرت سے کچھ باتیں کرنا چاہیئے اور باتیں بھی ایسی ہونا چاہئیں جو ان کے مذاق کے موافق ہوں۔ تو آپ پوچھتے ہیں کہ حضرت وہ کون سی

---

(۱) نہ اس حیثیت سے کہ یہ ابراہیم وموسیٰ کی شان ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں جمع ہیں

چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن سے ایمان جاتا ہے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہمارا ایمان نہیں جاتا بے وقوفوں کا جاتا ہے۔ خانصاحب شرمندہ ہوئے اور تاویل کی غرض سے کہا کہ حضرت یہی کفر و شرک کی باتیں جو ہوجاتی ہیں حضرت نے فرمایا کہ خانصاحب کفر و شرک جب تمہارے یہاں چھوٹی باتیں ہیں تو وہ بڑی باتیں کونسی ہوں گی۔ خانصاحب سن کر چپ ہوگئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان ایسی شئی نہیں ہے کہ شیطان کا موت پی لینے سے جاتا رہے۔ بلکہ اگر شیطان کو کوئی بھون کر کھاجاوے جب بھی ایمان نہیں جاتا۔

آیت کی غلط تفسیر میں ایک بے ہودہ حکایت

کانپور میں ایک حافظ آئے تھے، انہوں نے من شرالوسواس الخناس کی یہ تفسیر بیان فرمائی تھی کہ وسواس سے مراد شیطان ہے اور خناس سے شیطان کا بیٹا اور یہ کہا کہ اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے باہر آگئے تو وسواس حضرت حوا علیہا السلام کے پاس اپنے بچہ خناس کو لایا اور کہا کہ یہ رکھ لو میری امانت ہے۔ حضرت حوا نے رکھ لیا۔ آدم علیہ السلام جب آئے تو پوچھا یہ کیا ہے۔ حضرت حوا نے فرمایا کہ ایک غریب مسکین آیا تھا امانت رکھ گیا ہے۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا وہ شیطان تھا۔ غرض اس کو نکال دیا۔ وہ دوسری بار شکل بدل کر پھر آیا۔ پھر ایسا ہی کردیا۔ کئی بار کے بعد آدم علیہ السلام اس بچہ کا قیمہ بنا کر کھا گئے شیطان مسمی وسواس[1] جب آیا اور کہا کہ میرا بچہ لاؤ آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو ہم کھا گئے۔ وسواس نے پکارا بیٹا خناس تو اس نے پیٹ کے اندر سے جواب دیا کیوں بابا وسواس۔ پس یہ معنی ہیں من شرالوسواس الخناس کے یعنی وسواس تو

(۱) شیطان جس کا نام وسواس تھا

وہ ہے جو باہر سے وسوسہ ڈالے اور خناس وہ جو اندر اندر بیٹھا وسوسے **ڈالتا** ہے۔ خیر یہ حکایت تو مہمل گپ ہے۔ باقی اگر بالفرض کوئی شخص شیطان کو کہا جائے تب بھی اس کا ایمان نہیں جاتا۔

بچوں سے عبادت کرانا بڑوں کی ذمہ داری ہے

اور گناہ میں بھی اس امر کا اعتبار ہے جو علم اور شعور اور عقل و بلوغ کے ساتھ ہو اسی واسطے بچے جو کچھ کریں ان سے مواخذہ نہیں۔ بلوغ کے بعد وہ مکلف ہوتے ہیں۔ اس کو سن کر لڑکے بہت خوش ہوں گے کہ ہمارے ذمہ کچھ نہیں ہم تو خوب چھوٹے یہ تو صحیح ہے کہ تمہارے ذمہ نہیں لیکن ہمارے ذمہ تو ہے کہ تم سے مار کر کام لیں تاکہ بلوغ کے بعد تم کو نیک کام کی عادت ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اپنے بچوں کو جب وہ سات سال کے ہوں نماز کا حکم کرو اور جب دس سال کو پہنچیں تو مارو۔

عوام کے غلط خیال صدقہ میں کالا بکرا دینے کی اصل وجہ

غرض اس کی کوئی اصل نہیں ہے کہ عصر و مغرب کے درمیان کھانا نہ کھاؤ یا کہ کسوف کے وقت کھانا نہ کھاؤ۔ البتہ کسوف کے وقت مستحقین کو خیرات دو۔ اب بجائے مستحقین کے بھنگی مانگتے ہوئے پھرتے ہیں۔ خیر ہمارے اطراف میں مسلمانوں سے تو نہیں مانگتے لیکن بعض جگہ مسلمان بھی ان کو دیدیتے ہیں اور بعض جگہ یہ رسم ہے کہ صدقہ میں خاص چیزیں دیتے ہیں۔ ماش کی دال۔ پیسے، تیل۔ میں نے جو ان میں وجہ مناسبت سوچی تو یہ سمجھ میں آیا کہ یہ تینوں چیزیں کالی ہیں۔ اور بھنگی بھی اکثر کالے کالے ہوتے ہیں اور بلا کی صورت بھی کالی ہی سمجھتے ہیں

اس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں میں بلا لپٹی ہوئی ہے ان کے دینے سے بلا جاتی رہیگی۔ یاد رکھو خیرات اگر دو کسی اپنے بھائی غریب کو دو اور پھر خیرات میں ان چیزوں کی تخصیص نہیں ہے یہ شگون اور مشرکین کی رسم ہے۔

سورج گرہن کی وجہ اور اس وقت کے مسنون اعمال

مسلمانوں کو جو تعلیم کی گئی وہ یہ کہ ایسے وقت صدقہ دیں اور جماعت کا اگر اہتمام ہوسکے تو صلوٰۃ الکسوف جماعت سے پڑھیں اور اپنے گناہوں سے استغفار کریں۔ اس لیے کہ اس کی وجہ حدیث شریف میں یہ آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں کہ ہم کو اتنی قدرت ہے کہ بڑے جسم منور کو بے نور کردیا تو تم گناہ مت کرو ورنہ تم بھی عذاب میں مبتلا ہوگے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ع
بدر گستاخی کسوف آفتاب"[1]۔

اور حدیث میں آیا ہے کہ جب تم اس قسم کی قدرت کی نشانیاں دیکھا کرو تو فافزعوا الی ذکراللّٰہ یعنی اللہ کے ذکر کی طرف ملتجی ہوجایا کرو ایسے ہی اگر آندھی آوے یا آگ لگجاوے تو اس وقت بھی ذکر اللہ کیا کرو۔ سبحان اللہ کیا تعلیم ہے۔ اس سے دو فائدے ہیں۔ اول تو گناہ معاف ہوں گے یہ تو آخرت کا ثمرہ ہے اور دنیا میں یہ کہ دل کو اطمینان اور چین ہوگا اس لیے کہ ارشاد ہے الا بذکراللّٰہ تطمئن القلوب"[2] یعنی خبر دار ہو اللہ ہی کی یاد سے قلوب مطمئن ہوتے ہیں سچ ہے خدائے پاک کے نام میں اس قدر حلاوت اور چین[3] ہے کہ کسی میں نہیں بلکہ چین کا تحقق ہی بجزاللہ[4] کے نام کے کسی شئے[5] میں

---

(۱) چاند کی گستاخی سورج گرہن کا سبب بنتی ہے (کہ وہ زمین پر سورج کی روشنی درمیان میں حائل ہوکر پڑنے سے روک دیتا ہے) (۲) سورۃ رعد آیت ۲۸ (۳) سکون اور سکون (۴) سوائے اللہ کے نام کے (۵) چیز

نہیں اس لیے کہ "الا" حرف تنبیہ ہے اور بذکر اللہ کے تقدیم کے ساتھ جو مفید حصر[۱] ہے فرمایا ہے اور اطمینان کے معنی عربی میں سکون کے ہیں۔ چنانچہ اس کا تجربہ ہے کہ جب ذکر قلب میں رچ جاتا ہے تو اس کو نہ کوئی گھبراہٹ کی شے اور نہ کوئی وحشت کی چیز بلا نہیں سکتی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ **لایحزنھم الفزع الاکبر**[۲] یعنی بڑی گھبراہٹ یعنی قیامت ان کو غمگین نہ کرے گی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست
عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

(عاشقوں کو قیامت میں کوئی اور کام نہ ہوگا سوائے اس کے کہ وہ جمال یار یعنی تیرا جلوہ دیکھتے رہیں گے)

قیامت کے دن مومنین صالحین کو گھبراہٹ نہیں ہوگی

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ روز قیامت باوجود اس کے کہ پچاس ہزار برس کا دن ہوگا لیکن مومن پر ایسا گذر جائے گا کہ جیسے فرض نماز کا وقت۔ پس جب ایسی شدید گھبراہٹ سے بھی وہ نہ گھبرائیں گے تو دنیا کے ہولناک واقعات تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ ان سے مومن کیوں از جاء رفتہ[۳] ہونے لگا ہے حالانکہ قیامت کی گھبراہٹ اور شدت ایسی ہولناک ہے کہ جس کی نسبت حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

---

(۱) اصل عبارت یوں ہوتی تطمئن القلوب بذکر اللہ جب "الا" حرف تنبیہ کے ساتھ بذکر اللہ کو پہلے ذکر کیا تو عربی قاعدے سے کہ تقدیم ما حقہ التاخیر حصر کا فائدہ دیتا ہے تو یہ معنی ہو جائیں گے کہ اطمینان صرف اللہ ہی کے ذکر میں ہے (۲) سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۳ (۳) گھبرانے لگا

یاایھاالناس اتقو ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم۔ یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت و تضع کل ذات حمل حملھا وترالناس سکاریٰ و ماھم بسکاریٰ ولکن عذاب اللہ شدید[۱]

توجواس سے مامون ہے یہاں کے احوال سے کیا متاثر ہوگا چنانچہ شیخ شیرازیؒ اسی کو فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نہ باشد زکس　　ہمیں ست بنیاد توحید وبس

(موحد کے پاؤں پر چاہے دنیا کی دولت ڈالدی جائے چاہے اس کے سر پر فولاد ہندی یعنی تلوار رکھدی جائے اس کو نہ کسی سے امید ہوتی ہے اور نہ خوف بس توحید کی یہی بنیاد ہوتی ہے)

غرض کیسی ہی شدت اور پریشانی ہو ذکراللہ ایسی دولت ہے کہ اس سے سب بھاگ جاتی ہے۔

افلاطون کی حکایت

افلاطون موسیٰ علیہ السلام سے ملا اور یہ پوچھا کہ اگر آسمان کی کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور زمین نشانہ ہو تو آدمی کہاں جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا کہ تیر انداز کے پاس جاکر کھڑا ہوجائے۔ افلاطون بولا کہ یہ جواب بجز نبی کے کوئی نہیں دے سکتا۔ مگر باوجود اس کے اکثر حکماء حضرات انبیاء علیہم السلام کی نسبت یہ کہتے تھے کہ یہ نبی تو ہیں مگر ہمارے لیے نہیں صرف جہلاء کے لیے ہیں۔ حالانکہ اس پر سب کا اتفاق

(۱) سورۃ الحج آیت ۱-۲

ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا اور موسیٰ علیہ السلام خود کہتے ہیں کہ میری نبوت خاص نہیں جہلاء کے ساتھ پس حکماء کا عذر مہمل محض[1] ہے۔

ہر مصیبت کا علاج ذکراللہ ہے

غرض ذکراللہ وہ شئے ہے کہ حق تعالیٰ کا اس سے قرب ہوتا ہے اور تمام مصائب کا علاج ہے جب چاہے تجربہ کرلو کہ ایک ہی قسم کا حادثہ اگر دو شخصوں پر نازل ہو تو ان میں سے جو نمازی وصاحب نسبت ہوگا اس پر وہ خفیف ہوگا اور غیر نمازی یا غیر صاحب نسبت پر وہ بہت ثقیل اور شدید ہوگا اس لیے فرمایا کہ کسوف کے وقت اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کو منحوس سمجھنا بے وقوفی ہے

ایک بات یہ مشہور ہے کہ کسوف[2] و خسوف[3] کا وقت منحوس ہوتا ہے ایسے وقت نکاح یا کوئی شادی کی تقریب نہ کرنا چاہیے۔ میں نظام آباد علاقہ حیدر آباد میں اپنے بھتیجے کا نکاح کرنے گیا تھا جو دن اور جو بوقت نکاح کے لیے قرار پایا تھا اس وقت خسوف ماہ[4] ہوگیا اب وہاں کے لوگوں میں کھلبلی پڑی کہ ایسے وقت میں کیا نکاح ہوگا۔ اور اگر ایسے وقت نکاح کیا تو تمام عمر نحوست کا اثر رہے گا۔ بہت سے جنٹلمین بھی اس مہملات[5] میں مبتلا تھے۔ چنانچہ جمع ہوکر میرے پاس آئے اور یہ کہا کہ عرض کرنا ہے میں نے کہا فرمایئے۔ کہنے لگے کہ کیا چاند گرہن کے وقت بھی نکاح ہوگا۔ میں نے کہا اس وقت تو نکاح کرنا بہت ہی اولیٰ و افضل

(۱) حکماء کا عذر بالکل بیکار ہے (۲) سورج گرہن (۳) چاند گرہن (۴) اس وقت چاند گرہن ہوا (۵) بیکار باتوں میں

ہے اور میرے پاس اس کی دلیل بھی موجود ہے وہ یہ ہے کہ آپ صاحبو! کو معلوم ہے کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ خسوف کے وقت ذکراللہ و نوافل میں مشغول ہونا چاہیے۔ اب سمجھیے کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ نکاح میں مشغول ہونا نوافل میں مشغول ہونے سے افضل ہے۔ پس ایسے وقت نکاح کا شغل اور بھی افضل و اولیٰ ہے۔ ان سب نے اس کو تسلیم کرلیا اور میں نے بیان بھی کردیا لیکن میرے دل میں ان لوگوں کے خیال سے ایک انقباض[1] رہا اور دعا کی کہ اے اللہ جلدی چاند صاف ہوجائے۔ اگر اس حالت میں نکاح ہوا اور بعد میں کوئی حادثہ تقدیر سے پیش آیا تو ان لوگوں کو کہنے کی گنجائش ہوگی کہ ایسے وقت نکاح کیا تھا اس لیے یہ بات پیش آئی ۔ اللہ کی قدرت تھوڑی دیر میں چاند صاف ہوگیا۔ سب خوش ہوگئے۔ اور نکاح ہوگیا۔ بہر حال ان اختراعات[2] کو و خیالات کو چھوڑنا چاہیے۔ یہ سب مضمون ۲۸ تاریخ پر یاد آگیا تھا۔

۲۹ شعبان کو روزہ رکھنے کی ممانعت کی وجہ

ایک بات اور ضروری یاد آئی وہ یہ ہے کہ آج ۲۸ ہے اور کل ۲۹ اور پرسوں کا دن مشکوک ہے، اگر ۲۹ کو چاند نظر آگیا تو عید ہوجائے گی۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ عوام الناس کو شاید شبہ رہے کہ چاند ۲۹ شعبان کو یہاں تو نظر آیا نہیں اس لیے یہاں کے حساب سے آج ۲۸ تاریخ نہیں بلکہ ۲۷ ہے۔ اس لیے اطلاع کی جاتی ہے کہ باہر سے خبریں معتبر آگئی ہیں اس لیے ایک روزہ بھی رکھنا چاہیے۔ بعض لوگوں کو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ ہمیشہ ہی فضیحتا[3] ہوتا ہے اس سے تو بہتر یہ ہے کہ ۳۰ شعبان کو ہمیشہ روزہ رکھ لیا کریں اگر خبریں آگئیں تو رمضان میں

(۱) دل میں تنگی سی رہی (۲) ان من گھڑت باتوں اور بے ہودہ خیالات کو (۳) ہمیشہ ہی گڑبڑ ہوتی ہے

محسوب [1] ہوجاوے گا ورنہ نفل ہوجاوے گا تو یاد رکھو کہ اس دن کے روزہ رکھنے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے البتہ خواص کو جائز لکھا ہے اور وجہ فرق کی یہ ہے کہ اگر عوام کو بھی اجازت دیدی جائے تو تھوڑے دنوں میں ایسا ہوگا کہ اگر شعبان کی طرح رمضان بھی تیس کا ہوا اور روزہ شروع کیا تھا ۳۰ شعبان سے جس سے ۲۹ رمضان کو پورے ۳۰ دن ہوجاویں گے تو عوام الناس رمضان کی ۲۹ تاریخ پوری کرکے ۳۰ تاریخ کو عید کرلیا کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ہم نے ۳۰ روزے تو رکھ لیے اس لیے عوام کو منع کیا جاتا ہے اور خواص کو اجازت ہے۔ بہر حال کل ۲۹ تاریخ ہے یہ سب مضامین اخیر تاریخ کے اوپر یاد آگئے۔ اب میں اصلی مضمون بیان کرتا ہوں۔

دوسری اقوام کے مجاہدوں کی کوتاہیاں

جاننا چاہیے کہ جیسے افتتاح مجاہدہ کے متعلق اول مضامین بیان کیے گئے تھے۔ اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختتام مجاہدہ کے متعلق مضمون بیان کیا جاوے اختتام کے مناسب یہ آیت ہے جو میں نے تلاوت کی ہے میں پہلے یہ بیان کرچکا ہوں کہ دوسرے لوگوں کے مجاہدوں میں چند کوتاہیاں تھیں کہ اول تو ان کا اختتام نہ تھا دوسرے یہ کہ ان میں یسر یعنی سہولت نہیں تھی اور جس قدر بھی مجاہدات ایسے ہیں کہ ان میں وحی کی اعانت نہیں ہے ان میں تیسیر [2] کی رعایت نہیں بہت دشواری ہے اور کبھی اس مجاہدہ کا خاتمہ نہیں ہے گویا مجاہدہ ہی کو اصل مقصود سمجھتے ہیں۔ تیسری کوتاہی یہ ہے کہ اس قدر مجاہدہ جب کوئی کرتا ہے تو اس کو عجب ہوجاتا ہے کہ میں بڑا کام کرتا ہوں اور اگر کچھ حاصل نہ ہوا تو اس مجاہدہ کو

(۱) رمضان میں شمار ہوجائے گا (۲) آسانی

بیکار سمجھتا ہے۔ چنانچہ اہل مجاہدہ کو اس قسم کی آفتیں پیش آتی ہیں اکثر ذاکر شاغل[۱] شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو کوئی نفع نہیں ہوا یہ شکایت وہی شخص کرے گا جو اپنے کو مستحق سمجھے گا یہ شکایت فی الواقع دعویٰ ہے استحقاق کا اور دلیل عجب[۲] کی ہے اور چوتھی کوتاہی مجاہدہ میں یہ تھی کہ اگر مجاہدہ میں کچھ ثمرات مرتب ہوں گے تو ان کو حق تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر شکر نہ کرے گا بلکہ اس کو ثمرہ اپنے عمل کا سمجھے گا، اور پانچویں کوتاہی یہ ہے کہ چونکہ ان کے مجاہدہ کا اختتام نہیں ہے اس لیے ہمیشہ ہمیشہ کو دنیا کی لذات سے محروم رہے گا۔ چنانچہ بہت مجاہد ایسے ہیں کہ گوشت، گھی، میوہ جات نہیں کھاتے اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوں گی تو شکر بھی حق تعالیٰ کا ان پر نہ ہوگا۔

اسلامی مجاہدے کی خوبیاں

اللہ تعالیٰ ان سب کا جواب اور مجاہدات ارشاد شدہ کی شان اس آیت میں بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: **یریداللہ بکم الیسر ولا یریدبکم العسر**[۳]۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت کا ارادہ فرماتے ہیں اور تم پر سختی کا ارادہ نہیں کرتے۔ یہ ابطال[۴] اس کوتاہی کا کہ ان کے مجاہدات میں دشواری ہی دشواری ہے۔ یہاں تو یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ جن مجاہدات کی تعلیم کی گئی ہے وہ سب نہایت لطیف اور ہماری طبیعت اور مذاق کے موافق اور نفع میں سب مجاہدوں سے بڑھ کر ہیں **کما بینا بالادلۃ فی المواعظ السابق**[۵]۔ آگے ارشاد ہے **ولتکملوا العدۃ** اور تاکہ تم شمار کو پورا کرلو

(۱) ذکر کرنے والے (۲) تکبر (۳) البقرہ آیت ۱۸۵ (۴) اس آیت میں اس اشکال کو رد کردیا کہ مجاہدے میں دشواری ہے (۵) جیسا کہ ہم نے پچھلے وعظوں میں ان کو دلائل سے بیان کردیا

یہ اس کوتاہی کا ابطال ہے کہ ان کے مجاہدہ کا کہیں خاتمہ ہی نہیں اور نہ اس میں تکمیل ہے[1]۔ یہاں اختتام بھی ہے اور اکمال بھی[2] ایک کوتاہی یہ تھی کہ مجاہدہ کرکے ناز ہوتا تھا اور یہ اس طریق میں سخت مضر ہے اس کو دفع فرماتے ہیں ولتکبرالله علی ماھداکم یعنی تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی و لعلکم تشکرون یعنی اور تاکہ تم شکر کرو۔ یہ اس کوتاہی کی تکمیل ہے کہ ان کے مجاہدہ کے اختیار کرنے میں نعم اور لذات سے محرومی[3] تھی تو نعمتوں کا شکر بھی ادا نہ ہوتا تھا اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانی فرمائی کہ خوب سب کچھ کھاؤ پیو اور شکر کرو۔ بعض مفسرین نے لتکبروا اللہ علی ماھداکم سے تکبیرات عیدین مراد لی ہیں۔ یعنی روزوں کے شمار کو پورا کرنے کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر عید کی نماز میں کہو۔ میں نے اس کو اختیار نہیں کیا اس لیے کہ میرا ذوق اس سے آبی[4] ہے۔ اس لیے میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا لیکن اس سے بھی میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یہ تو اجمالاً اس آیت کا حاصل ہے۔

تفسیر و تشریح آیت

اب میں تفصیلاً اس کی شرح کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری آسانی چاہتے ہیں منجملہ آسانیوں کے ایک آسانی تو یہ ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا اور خود عین مجاہدہ کے وقت بہت آسانیاں ہیں چنانچہ اعتکاف میں یہ سہولت فرمائی کہ مسجد میں اس کو مشروع فرمایا تاکہ خلوت در انجمن کا مضمون ہوجاوے۔ اعتکاف سے آدمی اس کا خوگر[5] ہوجاتا ہے سب سے الگ ایک گوشہ میں بھی بیٹھے ہیں اور

(۱) ان کا مجاہدہ نہ کہیں ختم ہوتا ہے نہ مکمل ہوتا ہے (۲) اسلامی مجاہدہ ختم بھی ہوجاتا ہے اور مکمل بھی (۳) نعمتوں اور لذتوں سے محرومی تھی (۴) میرا ذوق اس سے انکار کرتا ہے (۵) عادی

سب کے ساتھ شریک بھی ہیں۔

از بروں شو آشنا و از دروں بیگانہ وش

ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

(کسی کے ظاہر سے آشنا رہو اور اس کے باطن کی کھود کرید مت کرو اور یہ اتنی مناسب روش ہے کہ دنیا میں کم پائی جاتی ہے)

(لاخلوۃ الاملاء اور دل بیار است بکار، اعتکاف کی شان[1] ہے اگر بالکل تنہائی کا حکم ہوتا تو نفس پر بہت گراں[2] ہوتا اسی طرح رمضان کے روزہ کو دیکھیے بظاہر اس میں مشقت ہے لیکن واقعہ میں بہت آسان ہے۔ چنانچہ نفل روزہ کا اگر کبھی اتفاق ہوجاتا ہے تو اس میں بہت مشقت معلوم ہوتی ہے اور رمضان المبارک کی ایسی برکت ہے کہ اس میں کچھ بھی مشقت معلوم نہیں ہوتی۔ رمضان کی برکت اس قدر صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ جس کو کچھ بھی احساس ہو وہ بے تکلف اس کا ادراک کرتا ہے۔ شب برات کے دن جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ اس روزہ کا اور رمضان المبارک کے روزہ کا مقابلہ کر کے دیکھیں اس روزہ میں بہت مشقت معلوم ہوئی تھی اور رمضان المبارک میں کچھ بھی نہیں۔ اہل مجاہدہ یہ بات کہاں سے لاویں گے، ان برکات کا علم بجزوحی[3] کی تعلیم کے کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتا۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید

لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

(گر مصور اس محبوب کی تصویر کھینچے گا تو میں حیران ہوں کہ اس کے ناز کی تصویر کیسے کھینچے گا)

---

(۱) نہ بہت میل جول نہ بالکل علیحدگی بلکہ دل یار کے تصور و کام میں لگا ہوا ہے یہ ہے اعتکاف کی شان
(۲) بھاری (۳) سوائے وحی الٰہی کے

تراویح کے اندر جو آسانیاں ہیں وہ بھی مخفی نہیں ہیں آگے ارشاد ہے: ولتکملوا العدة[۱] اس کی ترکیب میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعضے تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا عطف یرید اللہ پر ہے اور تقدیر کلام کی یہ ہے کہ شرع اللّٰہ ھذہ الاحکام لارادۃ التیسیر ولا کمال العدة[۲]۔ الخ بعض نے کہا ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے اور اصل کلام یہ ہے شرع ھذہ الاحکام لتکملوا العدة الخ۔ اور یہ حذف واؤ کے[۳] بعد ہے اور ایک بزرگ کے کلام سے میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ حذف واؤ کے قبل[۴] ہے اور لتکملوا کا معطوف علیہ مقدر[۵] ہے اور اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ تو مسئلہ مشہور و مسلم ہے[۶] کہ حق تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض[۷] نہیں ہیں لیکن ان میں حکمتیں ضرور ہیں اور کہیں کہیں حق تعالیٰ نے اپنے افعال کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید یہی حکمتیں مقصود بالذات[۸] ہوں احکام فی نفسہا مقصود نہ ہوں اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس شبہ کو دفع[۹] کیا جاوے اس لیے بعض جگہ اس حکمت پر حرف عطف لائے اور معطوف علیہ کو حذف فرمادیا اور چونکہ عطف کا مقتضی مغائرت ہے متعاطفین[۱۰] کی، اور معطوف ہے اعتبار حکمت تو معطوف علیہ ہوگا، عدم اعتبار حکمت جس کا ماحصل یہ ہوگا کہ یہ احکام اس لیے بھی

---

(۱) اللہ تعالیٰ نے یہ احکام آسانی پیدا کرنے اور گنتی کی تکمیل کے لیے مقرر فرمائے ہیں (۲) اللہ نے ان احکام کو آسانی اور گنتی پورا کرنے کے لیے مقرر فرمایا ہے (۳) یعنی یہ عبارت محذوف یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر کے بعد لتکملوا سے پہلے جو واؤ ہے اس کے بعد عبارت یوں ہوئی یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر وشرع ھذہ الاحکام لتکملوا العدة (۴) یعنی یہ عبارت محذوف واؤ سے پہلے ہے (۵) ولتکملوا میں واؤ عاطفہ ہے اور اس کا معطوف علیہ پوشیدہ ہے (۶) یہ مسئلہ تو طے شدہ اور مشہور ہے (۷) اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی کام کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہوتا (۸) شبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حکمت ہی مقصود ہے حکم مقصود نہیں (۹) شبہ دور کیا جائے (۱۰) عطف معطوف معطوف علیہ میں غیریت کو چاہتا ہے

وضع فرمائے کہ حاصل اس حکمت کا یہاں یہ ہے کہ تم شمار کو کامل کرلو یعنی مجاہدہ کو ختم کردو۔

مجاہدے کا اختتام

اور ختم بھی ایسا کیا کہ اس تاریخ پر اگر کوئی ختم نہ کرے تو مجرم ہوگا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ماں بچہ کو اصرار کرے کہ یہ شئ کھالو اسی شفقت سے بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے حق تعالیٰ اپنے بندوں کو کھلاتے ہیں اگر کوئی شبہ کرے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عید کے دن کھانا فرض ہے حالانکہ کھانا فرض نہیں۔ جواب یہ ہے کہ کھانا دو قسم کا ہے ایک بالقوہ[1] دوسرے بالفعل[2]۔ بالفعل تو ظاہر ہے کہ تحقیق کھانے کا ہو اور بالقوہ یہ ہے کہ کھانے کی قوت یعنی نیت روزہ کی نہ ہو اگرچہ نہ کھائے پس مجاہدہ ہر حال میں ختم ہوجائے گا اس لیے کہ مشقت تو نفس کو اسی وجہ سے ہے کہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ کھانے کے لیے رات ہی کو ملے گا اور جب جانتا ہے کہ جب چاہوں کھاسکتا ہوں تو مجاہدہ ختم ہوگیا۔

افطار اکبر

ایک بات ضروری قابل اطلاع یاد آگئی وہ یہ ہے کہ عوام عید کی صبح کو کہا کرتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ ہم بچپن میں بہت دنوں تک یہی سمجھتے تھے کہ آج بھی روزہ ہوتا ہے اور شب[3] نہیں ہوتا ہے تو یاد رکھو آج روزہ نہیں ہے نہ رات کو نہ دن کو اور حقیقت اس کہنے کی کہ روزہ کھول لو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک ماہ تک جو روزہ رکھا ہے تو آج یہ ظاہر کردو کہ روزہ نہیں ہے گویا رمضان المبارک کے ہر دن

---

(۱) کھانے کی طاقت ہونا (۲) عملاً کھانا کھانا (۳) رات

کے ختم پر تو خاص اسی دن کے روزہ کا افطار ہوتا تھا اور آج تمام مہینے کے دنوں کا ایک افطار ہے۔ یعنی اور دنوں میں افطار اصغر[1] تھا آج افطار اکبر[2] ہے۔

شبہ اور اس کا جواب

اگر کوئی کہے کہ مجاہدہ تو ساری عمر ضروری ہے اس لیے کہ نفس سے تو کسی وقت بھی امن نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

نفس اژدہاست او کے مردہ است   از غم بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ کبھی نہیں مرتا البتہ اپنی آگ کے سرد ہونے کی وجہ سے افسردہ رہتا ہے)

اور فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا

ما چو مرغان حریص بے نوا

دم بدم پا بستہ دام نوایم   گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم

(دنیا میں سیکڑوں جال اور دانے بکھرے ہوئے ہیں اور ہماری مثال بھوکے لالچی پرندوں کی طرح سے ہے۔ اگر ہم شہباز اور سیمرغ ہی کیوں نہ ہو جائیں پھر بھی قدم قدم پر نئے نئے جالوں میں پھنس جاتے ہیں)

تو جواب اس کا یہ ہے کہ علی الاطلاق مجاہدہ کا اختتام[3] نہیں ہوا کہ اس کے بعد کسی قسم کا مجاہدہ نہیں ہوگا بلکہ ایک خاص قسم کا مجاہدہ ختم ہوگیا۔ اس لیے کہ اگر وہ متواتر علی الدوام رہتا تو نفس کو بولا بحد شاق ہوتا[4] اس لیے اس میں حق

(۱) چھوٹا افطار (۲) بڑا افطار (۳) بالکلیہ مجاہدہ کا اختتام نہیں ہوا (۴) اس لیے کہ یہ روزہ کا مجاہدہ اگر ہمیشہ ہمیشہ رہتا تو نفس پر بہت بھاری ہوتا

تعالیٰ نے تعاقب رکھا ہے کہ چند روز مجاہدہ کرو اور چند روز آرام کرو اور بعد بے حد مشقت[1] کے پھر اس مجاہدہ کا اثر ضعیف[2] ہو کر مجاہدہ نہ رہتا بلکہ وہ طبیعت بن جاتا۔ چنانچہ جو لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں ان کی آنتیں اور معدہ خشک ہو جاتا ہے اور ان کو اضطراب اور اشتہا[3] نہیں رہتی تو ان کے نہ کھانے میں کوئی کمال نہیں ہے۔ سوہان روح اور علاج نفس[4] تو یہ ہے کہ کبھی کھاویں اور کبھی نہ کھاویں اسی واسطے محققین نے مقیمین[5] مکہ مکرمہ کو رائے دی ہے کہ کبھی کبھی ان کو مکہ مکرمہ سے چلا جانا چاہیئے کہ نشاط کی تجدید ہوتی رہے کیونکہ دوام کے اندر شوق[6] بھی بجھ جاتا ہے اور عادت سی ہو جاتی ہے اور نفس میں وہی شرارتیں سابقہ[7] عود کر آتی ہیں اور مجاہدہ کی غرض فوت ہو جاتی ہے۔

صوم وصال کی ممانعت کیوجہ

اسی واسطے روزہ نفل میں صوم الدہر افضل نہیں ہے بلکہ افضل یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے تاکہ نہ بہت شاق ہو نہ بالکل عادت ہو جائے۔ اور نیز اس میں حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر بھی رہتی ہے۔ اور نیز ہم لوگ بہت ضعیف ہیں جو عبادت سہولت سے ہوتی رہے وہ تو ہم سے ہوتی رہتی ہے اور اس میں حق تعالیٰ کی محبت باقی رہتی ہے اور زائد مشقت کے متحمل نہیں ہوتے اور نفس کو کلفت زائد ہونے سے محبت میں بھی کمی ہونے لگتی ہے۔ اسی واسطے ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق نفسانی ہیں ذات کے عاشق نہیں

(۱) سخت محنت اٹھانے کے بعد (۲) اس مجاہدے کا اثر کمزور ہو کر وہ مجاہدہ ہی نہ رہتا (۳) بے چینی اور خواہش (۴) روح کے لیے پریشانی کی اور نفس کا علاج (۵) مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر لوگ (۶) اس لیے کہ مستقل کوئی کام کرتے رہنے سے شوق ختم ہو جاتا ہے (۷) وہی پچھلی شرارتیں لوٹ آتی ہیں

ہیں۔ خلاف طبع پیش آنے سے اللہ میاں سے بھی ایک گونہ تکدر(۱) ہوجاتا ہے۔

جس کے لیے جیسی حالت مناسب ہو اللہ وہی مقدر فرماتے ہیں

ایک حدیث قدسی میں آیا ہے جس کو قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندوں کو خوب جانتا ہوں ان میں بعض ایسے ہیں کہ اگر میں ان پر فقر مسلط کردوں کہ تو کافر ہوجائیں اس لیے ان کو فقر سے بچاتا ہوں اور بعضے ایسے ہیں کہ اگر ان کو غنی کردوں تو کفر کرنے لگیں اس لیے ان کو محتاج رکھتا ہوں اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو تندرست رکھوں تو کفر کرنے لگیں ان کو بیمار رکھتا ہوں اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو بیمار رکھوں تو کفر کریں ان کو تندرست رکھتا ہوں۔ پس اسی واسطے بعض ایسے ہیں کہ ہمیشہ بیماری ہی میں رہتے ہیں اور بعض تندرست رہتے ہیں۔ جو حالت جس شخص کے لیے تجویز فرمادی ہے وہی اس کے لیے بہتر ہے اور اسی میں مصلحت ہے دیکھو ماں اگر بچہ کو مٹھائی نہ دے تو وہ اس کی مصلحت کو جانتی ہے۔

آنکس کہ توانگرت نے گرداند　　　او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو شخص تجھے امیر نہیں بناتا وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے)

ٹھنڈا پانی پینے سے بال بال شکر ادا کرتا ہے

اسی واسطے حق تعالیٰ نے مجاہدہ میں تعدیل فرمائی ہے۔ اگر دائمی مجاہدہ ہوتا تو

---

(۱) دل میں میل آجاتا ہے

بندے اکتا جاتے۔ ایک زمانہ آرام کا مقرر فرمادیا اس کے بعد پھر مجاہدہ مقرر فرمایا تاکہ نفس کو نشاط رہے اور نعمت کی قدر ہو اسی واسطے ہمارے حضرتؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میاں اشرف علی جب پانی پیو ٹھنڈا پیو تاکہ بال بال سے شکریہ ادا ہو۔ اور اگر گرم پانی پیوگے تو زبان سے تو الحمد للہ کہوگے مگر دل سے الحمد للہ نہ نکلے گا۔

شکر کی نیت سے اچھا کھانا اور اچھا پہننا افضل ہے

اور اسی واسطے شکر کی نیت سے اگر کوئی اچھا کھانا کھاوے اور اچھا کپڑا پہنے تو اس کے لیے افضل ہے گو ناواقف طعن کریں۔ خسروؒ اسی مضمون کو کہتے ہیں۔

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند
آرے آرے میکنم باخلق وعالم کار نیست

(دنیا کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے ہاں ہاں کرتا ہوں مجھے دنیا و مخلوق سے کوئی کام نہیں ہے)

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دم سے دیدیجیے۔ حکم ہوا کہ ہمارے وعدہ پر اطمینان نہیں۔ عرض کیا اطمینان تو ہے مگر شیطان مجھے بہکاتا ہے کہ تو کہاں سے کھائے گا تو میں کہدوں گا کہ اس میں سے کھاؤں گا۔ پس باوجود محبوب اور مقبول ہونے کے بعض میں ایک قسم کا ضعف[1] ہوتا ہے۔ اور قوت یقین میں ایسے لوگوں کے فرق نہیں ہوتا یہ ضعف طبعی ہوتا ہے ایسے لوگ اگر اچھا کھائیں اچھا پہنیں تو کچھ حرج نہیں ہے اس لیے کہ غرض ان کی یہ ہوتی ہے کہ جو ذرہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا قلب میں ہے وہ ضائع نہ ہوجائے ان کے لیے یہ نعمتیں ذریعہ ہوجاتی ہیں مشاہدہ جمال حق[2] کی اور

(۱) کمزوری (۲) اللہ کے جمال کو دیکھنے کا ذریعہ

جن کے لیے سبب غفلت کا ہوں ان کے لیے پرہیز لازم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کی طبیعت جدا ہے علاج جدا ہے۔ سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا یا ہر ایک کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا چاہیے۔

کثرت مجاہدہ سے پیدا ہونے والی بیماری

آگے ارشاد ہے وتکبیر اللہ علی ما حد اکمہ یہ اشکال ہے اس کمی کا جو اہل مجاہدہ کو بعض اوقات مجاہدہ سے پیش آجاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شدۃ مجاہدہ[1] سے بعض اہل مجاہدہ کو عجب[2] پیدا ہوجاتا ہے اور مجاہد[3] یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں یہ بڑی شے[4] ہے اور یہ بہت بڑا مرض ہے اپنے کو یہ شخص مستحق ثمرات[5] سمجھتا ہے اور جب وہ ثمرات نہیں حاصل ہوتے تو دل میں حق تعالیٰ کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ میرے ذمہ ہے وہ میں ادا کرتا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے وہ (نعوذ باللہ) ادا نہیں فرماتے۔

ذکر اللہ کی توفیق ہونا سب سے بڑا نفع ہے

حالانکہ کام مقصود ہے ثمرات[6] مقصود نہیں ہیں۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہمارے حضرت ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نہ آید آرزوئے میکنم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں مگر اس کی جستجو کرتا رہتا ہوں مقصود حاصل ہو یا نہ ہو آرزو

---

(۱) بہت مجاہدہ کرنے سے (۲) تکبر (۳) مجاہدہ کرنے والا (۴) بڑی چیز ہے (۵) انعامات کا مستحق سمجھتا ہے (۶) نتائج

کرتا رہتا ہوں)

مولاناؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک ذاکر تھے ہمیشہ رات کو اٹھ کر نماز پڑھتے ذکر کرتے ایک مدت گذر گئی ایک شیطان نے بہکایا، جی میں آیا کہ اتنے دن ہوگئے اللہ کا نام لیتے ہوئے نہ ادھر سے سلام ہے نہ پیام ہے۔ یہ محنت ہماری اکارت ہی گئی یہ سوچ کر سو رہا خواب میں حکم ہوا۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　وِیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(اس نے کہا کہ اے اللہ ہماری لبیک تیرے لیے ہے اور یہ عاجزی اور سوز و درد ہمارے تیرے لیے مقاصد ہیں)

ہمارے حضرت نے اس کی شرح اس طرح فرمائی کہ دیکھو کہ اگر کوئی شخص تمہارے سامنے تمہارا نام لے جس کا نام لینا تم کو برا معلوم ہو تو تم اس کو روک دیتے ہو پس جب تم نے حق تعالیٰ کا نام لیا اور انہوں نے پھر توفیق دی اور روکا نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا وہ نام لینا پسندیدہ اور مقبول ہے۔ یہ معنی ہیں آں اللہ تو لبیک ماست۔ اور یہ حسرت اور افسوس ہے اور تضرع و زاری بھی اسی کی دلیل ہے پس گویا یہ پیک حق ہے۔ حقیقت میں اللہ اللہ کرنا بڑی نعمت ہے اور ثمرات کا انتظار کرنا یہ دل کا چور ہے کہ اپنے عمل کو اس نے قابل استحقاق اجر سمجھا۔ خدا کی قسم ہے ہمارے اعمال تو اس درجہ کے ہیں کہ اگر ان پر عتاب ہی نہ ہو تو بسا غنیمت ہے۔ کس کے ثمرات اور کہاں کا اجر اگر اعمال کے بعد ثمرات ہوں تو وہ رحمت ہے باقی عمل کرنا تو بندہ کا کام ہی ہے خواہ قبول ہو یا نہ ہو اگر قبول ہو جاوے تو عین رحمت ہے۔

سبق آموز قصے

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ ہم حج کو جاتے تھے راستہ میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ نہایت آزادی سے جارہا ہے۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ صاحبزادہ تمہارے پاس زاد نہیں ہے تم کو تکلیف ہوگی۔ اس نے کہا۔

وفد علی الکریم بغیر زاد   من الحسنات والقلب السلیم
فان الزاد اقبح کل شئ   اذا کان الوفود علی الکریم[۱]

جب سب لوگوں نے احرام باندھا تو اس نے احرام بڑے سوچ سے باندھا اس سے پوچھا کہ میاں تم احرام جلدی کیوں نہیں باندھتے کہا کہ اس لیے نہیں باندھتا کہ ایسا نہ ہو کہ میں کہوں لبیک اور ادھر سے آواز آوے لا لبیک ولا سعدیک وحجک مردود علیک[۲]۔ جب منیٰ میں لوگ قربانی کرنے لگے اس جوان نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور عرض کیا کہ میرے پاس قربانی کا جانور تو نہیں صرف یہ جان حاضر ہے اگر قبول ہو۔ یہ کہتے ہی گرا اور جان بحق تسلیم ہوا[۳]۔

ثمرات پر نظر کیے بغیر عمل کرنا چاہیئے

اس پر ایک اور حکایت یاد آگئی ایک صاحب حال حج کو گئے جب بیت اللہ شریف پہنچے تو مطوف نے ان سے کہا کہ یہ ہے بیت اللہ۔ اس نے یہ شعر پڑھا۔

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر   کہ مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(۱) کریم کے دروازے پر جماعت کو نیکی اور سلامت قلبی کے ساتھ بغیر زاد راہ کے جانا چاہیے اس لیے کہ کسی کریم کے دروازے پر جماعتوں کا زاد راہ لیکر جانا سب سے بری چیز ہے۔ ۱۲ ش (۲) نہ تیری حاضری منظور، نہ تیرے لیے نیک بختی ہے اور تیرا حج تجھ ہی پر لوٹایا جاتا ہے (۳) اور اپنی جان اللہ کے سپرد کی

(اگر تیری پہنچ کوچہ جاناں میں ہوجائے تو بڑی بے قرار جان کو نثار کردینا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ اس تمنا کے ساتھ تو دوبارہ وہاں نہ پہنچ سکے)

اور یہ کہہ کر گرا اور جان دیدی پس دیکھیے یہ نوجوان عارف نے احرام باندھتے ہوئے جورد کا خوف کیا اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اعمال کچھ بھی نہیں پھر استحقاق ثمرات کیسا۔ پس خدمت کیے جاؤ اپنا کام یہی ہے کہ کام کرتے کرتے جان دیدیں اور کسی شئے کی طلب نہ ہو۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن

کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط کے ساتھ بندگی مت کر کیونکہ مالک خود جانتا ہے کہ اپنے بندوں کی پرورش کیسی ہوتی ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے عمل پر نظر نہ ہونا چاہیے اسی خود بینی کو **ولتکبروا اللہ**[1] الخ۔ رد فرماتے ہیں اس لیے کہ جب حق تعالیٰ کی بڑائی پیش نظر ہوگی تو اپنے اعمال اور خود اپنی ذات لاشئے نظر آویگی اور بجائے عجب کے شکر کرے گا۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے **ولعلکم تشکرون** اور جیسے دل سے بڑائی کی تعلیم ہے اسی طرح زبان سے بھی سکھلائی گئی ہے کہ عید کے راستہ میں اللہ اکبر اللہ اکبر زبان سے کہتے جائیں اور نیز پانچوں وقت کی نماز میں بھی اسی واسطے حکم فرمایا اللہ اکبر زبان سے کہیں اور اسی کی نظیر ہے نماز کی نیت کہ اصل نیت تو دل سے ہے لیکن زبان سے کہنا بھی فقہاء نے مشروع فرمایا ہے۔

(۱) اور چاہیے کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو

احکام الٰہی میں طبعی مذاق کی رعایت

الحاصل یہ بڑی رحمت ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا اور وجوبی حکم فرمایا کہ عید کے دن ضرور کھاؤ، پیو۔ دیکھیے اس میں ہماری مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے جیسے جمعہ کے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض[1] یعنی جب نماز ادا کرلی جاوے تو زمین میں متفرق ہوجاؤ ہم لوگ خود ایسے تھے کہ نماز کے بعد خود ہی بھاگتے۔ لیکن حکم بھی فرمادیا۔ اس میں بھی مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے اور یہی وجہ تشبیہ[2] ہے گو یہ حکم وجوبی[3] نہیں اور نیز ایسے دلدادہ[4] بھی تھے جو مسجد ہی میں رہ جاتے ہیں بقول امیر خسروؒ۔

خسرو غریب ست ایں گدا افتادہ در کوئے شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب ایسا فقیر ہے جو تیری گلی میں پڑا ہوا ہے پس اب تجھ کو چاہیے کہ خدا کے واسطے غریبوں کی طرف نظر کرے)

ان کیلیے بھی انتشار فی الارض[5] کو مصلحت سمجھا اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک کام سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور نیز طبائع اکثر ضعیف ہیں جب زیادہ پابندی ہوتی ہے۔ اور اس سے حرج معاش[6] ہوتا ہے اور حاجت ستاتی ہے تو ساری محبت رکھی رہ جائے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ یعنی زمین میں متفرق ہوجاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق طلب کرو۔

---

(۱) سورۃ الجمعہ آیت ۱۰ (۲) اس کے مشابہ قرار دینے کی وجہ یہی ہے (۳) نماز جمعہ کے بعد مسجد سے چلے جانے کا حکم اگرچہ واجب نہیں (۴) چاہنے والے بھی تھے (۵) زمین میں پھیل جانے کا حکم (۶) معاشی تنگی

بلاضرورت اجتماع کی ممانعت

علاوہ اس کے اس میں ایک تمدنی وسیاسی مصلحت بھی ہے جس کو میں نے ایک مرتبہ کراچی میں وعظ کے اندر بیان کیا تھا اس طرح سے کہ تمدن کے مسائل جیسے قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں ایسے دوسری جگہ سے نہیں ہوتے چنانچہ اس آیت سے بھی ایک مسئلہ مستنبط[1] ہوا کہ بلاضرورت اجتماع نہ ہونا چاہیے اگر بضرورت ہو تو رفع ضرورت[2] کے بعد فوراً منتشر ہوجانا چاہیے یہی وہ مضمون ہے جو تمام اہل سیاست مانے ہوئے ہیں کہ ناجائز مجمع کو منتشر کردیا جائے قرآن مجید میں اس مجمع کے ناجائز بننے سے پہلے ہی محض اس احتمال پر کہ اب ان کو کوئی کام تو رہا نہیں یہ ناجائز مجمع نہ بن جاوے سب کو منتشر کردیا گیا۔ اس وعظ میں ایک بڑا عالی مرتبہ انگریز بھی تھا اس نے بعد وعظ کے مسرت ظاہر کی۔

احکام عید کی مصلحتیں

الحاصل مجاہدہ کو ختم کرکے کھانے پینے اور عید گاہ میں جانے اور خوشی منانے کی اجازت دی اور اس میں بھی یہ نہیں کہ کوئی لہو ولعب[3] ہو بلکہ اس دن میں ایک خاص عبادت مقرر فرمائی اور اس کا طرز علیحدہ رکھا کہ شہر سے باہر صحرا میں جائیں اور اچھے اچھے کپڑے پہنیں اور وہاں نماز پڑھیں اور اس نماز کا طریقہ بھی جداگانہ رکھا کہ اور نمازوں سے اس میں چھ مرتبہ اللہ اکبر زیادہ ہے یہ اس لیے کہ جوش مسرت[4] میں موحد[5] اور خدا پرست کی زبان سے اللہ اکبر ہی نکلا کرتا ہے غرض ہماری فرحت بھی ایسی ہے کہ اس میں بھی عبادت ہے اور مشقت

(۱) مسئلہ نکلتا ہے (۲) ضرورت پوری ہونے کے بعد (۳) کھیل تماشہ (۴) جوش خوشی میں (۵) توحید پرست

میں بھی راحت ہے بخلاف اور قوموں کے کہ ان کے یہاں خوشی کے دن لہو و لعب اور بعض قوموں میں فسق و فجور[1] تک ہے اور اس دن میں ایک طریق ادائے شکر اور اظہار خوشی کا یہ مقرر فرمایا کہ اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرمایا اس لیے کہ حق تعالیٰ نے جو نعمت ہم پر فائز فرمائی کہ ہم سے ادا ہو گئے اس کا شکر یہ ہے کہ اپنے بھوکے ہونے کو یاد کر کے اپنے بھوکے مسلمان بھائی کی امداد کرے اور کم از کم دو وقت کی کفایت کے لیے اس کو کھانا دیدے اور نیز اس میں اپنی خوشی کی تکمیل بھی ہے اس لیے کہ مجمع میں اگر ایک شخص بھی کبیدہ[2] ہوتا ہے تو اس کا اثر سب پر ہوتا ہے تو اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرما دیا تا کہ سب مسلمان بھائی آج سیر اور خوش نظر آویں اور خوشی کی تکمیل ہو جائے ورنہ اپنے بھائی کو افسردہ دیکھ کر دل پھٹ جاتا ہے غرض اس میں ادائے شکر بھی ہے اور فرحت کی تکمیل بھی ہے اور اس کے ساتھ معنی صدقہ کے بھی اسی لیے غیر صائمین[3] اور صبیان[4] کی طرف سے بھی ادا کیا جاتا ہے۔

رمضان اور عید کی عبادات میں مناسبت

بہر حال رمضان کا تمام مہینہ تو مجاہدہ کا وقت ہے اور عید اس کا اختتام ہے اور اس اختتام یعنی عید اور مقصود یعنی مجاہدہ رمضان میں چند امور مشترک ہیں وہ یہ ہیں کہ رمضان المبارک میں بعض عبادتیں فرض ہیں بعض نفل ہیں مثلاً روزہ رکھنا فرض ہے اور تراویح و اعتکاف مسنون ہیں عید کے دن میں بھی بعض عبادتیں واجب ہیں بعض مستحب ہیں۔ عید کی نماز واجب ہے صدقہ فطر واجب ہے اور غسل کرنا عطر لگانا اور اچھے کپڑے پہننا مستحب ہے غرض دو قسم کی عبادتیں رمضان شریف

(۱) گناہوں کے کام (۲) رنجیدہ (۳) غیر روزہ دار (۴) بچے

ہیں ہیں ضروری اور غیر ضروری اور یہی دو ہی قسم کی عید کے دن میں ہیں۔

فرض اور نفل میں فرق

میں نے اپنے ایک وعظ میں اسی رمضان کے مواعظ میں سے وعدہ کیا تھا کہ فرض اور نفل میں جو اثر قرب کا اور اس قرب کے مراتب میں جو تفاوت[1] ہے اس کا بیان کروں گا۔ سو آج اس کا ایفاء[2] کرتا ہوں اور وہ مضمون اپنی طرف سے کوئی نکتہ نہ ہوگا بلکہ حدیث شریف ہی کا مضمون ہوگا بغور سنیے کہ فرائض کی نسبت حدیث قدسی میں آیا ہے کہ میرا بندہ جس قدر فرض ادا کرنے سے مقرب بنتا ہے اس قدر کسی شئے سے نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرض بہت بڑی شئے ہے[3]۔ اور نوافل کی نسبت ارشاد ہے۔ **لایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احببته فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع بی وبصره الذی یبصربی و یده التی یبطش بها** . یعنی میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے قرب تلاش کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو چاہتا ہوں تو میں اس کان بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے سنتا ہے۔ اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے پکڑتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ میاں توبہ توبہ اس کا کان، آنکھ، ہاتھ ہوجاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء سے اس سے کوئی کام حق تعالیٰ کے خلاف مرضی نہیں ہوتا۔

---

(۱) قرب الٰہی کے مرتبوں کے حصول میں جو فرق ہے (۲) آج یہ وعدہ پورا کرتا ہوں (۳) چیز

اصل قرب فرائض کی ادائیگی سے ہوتا ہے اور درجہ کمال نوافل سے

اب غور کیجیے کہ فرائض کی خاصیت یہ بیان فرمائی کہ جس قدر قرب ان سے ہوتا ہے اس قدر کسی عبادت سے نہیں ہوتا اور نوافل کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا شیئاً فشیئاً[1] حاصل ہوتا رہتا ہے۔ جیسا لایزال یتقرب[2] اس پر دال ہے تو حاصل اس کا یہ ہے کہ زیادت قرب دو قسم کا ہے ایک کیفیہ اور ایک کمیہ کا اور وہ دونوں مطلوب ہیں تو فرائض سے تو کیف کے اعتبار سے قرب بڑھتا ہے۔ اور نوافل سے کماً بڑھتا ہے بلا تشبیہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص سرکاری عہدہ دار ہے تو نفس قرب تو اس کو اپنا منصبی کام انجام دینے سے حاصل ہوگا اور اگر یہ کام نہ کرے تو قرب ہی نہ ہوگا۔ تو یہ منصبی کام بہت بڑی شئے ہے کہ اس نے اس کو سرکاری آدمی بنادیا ہے اب وہ چاہتا ہے کہ میرا قرب حاکم سے اور بھی زیادہ بڑھ جائے تو وہ حاکم کے خوش کرنے کے لیے ایسا کام اختیار کرے گا کہ وہ کام اس کے ذمہ نہیں ہیں مثلاً اس کے لیے ڈالی[3] لیجائے اور تحائف بھیجے، نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ حاکم کا بہت مقرب ہوجائے گا۔ حتیٰ کہ حاکم کے پاس بیٹھنا بھی اس کو نصیب ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس تشبیہ سے پاک ہیں لیکن بطور تمثیل[4] کے سمجھنا چاہیے کہ عاشق کو نفس قرب کیفی سے تسلی نہیں ہے اور اپنی استعداد کے اعتبار سے کمال قرب کمی کا طالب ہوتا ہے۔ مثلاً محبوب نے اپنے پاس خوش ہوکر بٹھلالیا تو وہ کھسکتا اور آگے مل کر بیٹھنا چاہتا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے دو عبادتیں مقرر فرمائیں ہیں فرض اور نفل قرب کا تعلق تو فرض کے ساتھ ہے۔ فرض

---

(۱) درجہ بدرجہ (۲) وہ قرب حاصل کرتا رہتا ہے (۳) ہدیہ وغیرہ (۴) بطور مثال

کے بعد کوئی درجہ کیف کا باقی نہیں رہتا۔ اور کم کا تعلق نفل سے ہے۔ اور کمیت قرب کے مراتب بیشمار ہیں جس قدر بھی مراتب طے کرے گا ختم نہ ہوں گے ور نہ سیری[1] ہوگی۔ برابر دل چاہتا رہے گا کہ اور بڑھے اور بڑھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ فرض کے ادا کرنے سے جو قرب حاصل ہوتا ہے عاشق کو اس مقدار سے تسلی نہیں ہوتی۔ اگر نوافل نہ ہوتیں تو وہ یقیناً تڑپ تڑپ کر مر جاتا اس لیے کہ دل کا تقاضا ہوتا کہ مراتب قرب کو طے کرے اور طریقہ کوئی نہیں تھا اس لیے شدت شوق میں اگر جان دیدیتا تو تعجب نہ تھا اور اب نوافل حق تعالیٰ نے مقرر فرمادیے ہیں کہ ان سے درجات طے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اذکار اشغال اور روزے و نماز نفل سب اسی واسطے ہیں کہ بندہ قرب کے درجات طے کرے اس لیے فرائض محدود ہیں۔ اور نوافل غیر محدود۔

قرب فرائض اور قرب نوافل کے درجات

خلاصہ یہ ہے کہ فرائض کے متعلق جو قرب ہے وہ ایک دم سے حاصل ہوجاتا ہے اور اس نوع میں کوئی درجہ باقی نہیں رہتا اور نوافل کے متعلق جو قرب ہے اس کی کوئی حد نہیں پس اس حکمت کی وجہ سے بعض عبادتیں فرض مقرر فرمائی ہیں۔ فرض روزہ بھی ہے۔ بعض نفل جن میں نفل روزے بھی ہیں جو دوسرے ایام میں بھی مشروع ہوئے تاکہ کوئی نوع قرب کی فوت نہ ہو۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اول کو قرب فرائض کہتے ہیں۔ اور دوسری نوع کو قرب نوافل کہتے ہیں اور چونکہ نوافل سے جو قرب ہوتا ہے وہ ختم نہیں ہوتا۔ اسی واسطے حدیث میں اس کو لایزال عبدی الخ سے تعبیر فرمایا ہے۔ بحمدللہ میں نے بقدر رسائی ذہن کے ان

[1] نہ دل بھرے گا

احکام کے اسرار و حکمتیں بیان کی ہیں مقصود میرا اس سے یہ ہے کہ آپ صاحبوں کو ان عبادتوں کو مع ان کے حقوق کے ادا کرنے کی رغبت ہو۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ توفیق عطا فرماویں۔ آمین یا رب العالمین (۱)۔

---

(۱) اپنی دعاؤں میں محشی اور اس کی اولاد کو بھی یاد رکھیے۔
خلیل احمد تھانوی